پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی
آئینۂ تصوف
رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرامؓ، اور سلف صالحینؒ کے متصوفانہ خدوخال کا آئینہ
يعلمهم الكتاب والحكمة ويزكيهم
تصوف فاؤنڈیشن
۱۴۱۹

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ (القرآن ۶۲:۲)
تزکیۂ نفس اور کتاب و حکمت کی تعلیم
بعثتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مقاصد عظیمہ تھے۔
ان ہی مقاصد کے لیے "تصوف فاؤنڈیشن" وقف ہے۔
يزكيهم ويعلمهم الكتب والحكمة
تصوف فاؤنڈیشن
۱۴۱۹ھ
ابو نجیب حاجی محمد ارشد قریشی (بانی)

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ○ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ○
بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ○ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ○

وہ فلاح پا گیا جس نے تزکیہ (نفس) کر لیا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا اور نماز پڑھی۔ مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔ (القرآن)

○

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ الْاَشْيَاءِ كَمَا هِيَ

یا اللہ ہمیں اشیاء کی حقیقتیں دکھا جیسی کہ وہ ہیں۔ (الحدیث)

○

تصوف فاؤنڈیشن کی زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدیئے یہ صدقہ جاریہ ہے
اِن کتابوں کی تمام آمدن صرف اشاعت کُتبِ تصوّف پر صرف ہوتی ہے

رسول اللہ ؐ، صحابہ کرام رضؓ، اور سلف صالحین رحؒ کے متصوفانہ خد وخال کا آئینہ

مؤلف و مصنف

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

مرتب و ناشر

ارشد قریشی بانی تصوف فاؤنڈیشن

○

تصوف فاؤنڈیشن

لائبریری ○ تحقیق و تصنیف و تالیف و ترجمہ ○ مطبوعات

۲۴۹ - این سمن آباد - لاہور - پاکستان - فون ۷۵۹۹۵۴۳

واحد تقسیم کار: المعارف - گنج بخش روڈ - لاہور

ناشر : ابونجیب حاجی محمّد ارشد قریشی
بانی تصوّف فاؤنڈیشن - لاہور

طابع : زاہد بشیر پرنٹرز - لاہور

سالِ اشاعت : ۱۴۲۰ھ —— ۱۹۹۹ء

تعداد : پانچ سو

قیمت : ۱۲۵؍ روپے

واحد تقسیم کار : المعارف۔ گنج بخش روڈ۔ لاہور، پاکستان

۷ — ۰۳۰ — ۵۰۶ — ۹۶۹ — آئی ایس بی این

○

تصوّف فاؤنڈیشن ابونجیب حاجی محمّد ارشد قریشی اور ان کی اہلیہ نے اپنے مرحوم والدین اور لختِ جگر کو ایصال ثواب کے لئے بطور صدقہ جاریہ اور یادگار یکم محرم الحرام ۱۴۱۹ھ کو قائم کیا جو کتاب و سُنّت اور سلف صالحین و بزرگانِ دین کی تعلیمات کے مطابق تبلیغ دین اور تحقیق و اشاعت کُتب تصوّف کے لیے وقف ہے۔

فہرست

پیش لفظ

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے "آئینہ تصوف" میں تصوف کے لفظ سے لے کر تصوف کی اہم حقیقتوں کو نہایت آسان، دلکش اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس مئوقف کو رد کیا ہے کہ "تصوف کا ماخذ قرآن اور حدیث نہیں ہے بلکہ اس کو یونان، ایران اور ہندوستان سے مستعار لیا گیا ہے"۔ انہوں نے تمہید میں روح عبادت، اللہ کی یاد اور اللہ کے مخلص بندوں کی خصوصیات بتائی ہیں۔ تصوف کی حقیقت پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے مقامات سلوک بیان کئے ہیں۔ جن میں توبہ، ورع، زہد، فقر، صبر، توکل، ایثار اور رضا کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے عہد نبوت و دور صحابہؓ سے تاحال تصوف کا تاریخی و تدریجی ارتقاء پیش کیا ہے۔ جو اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ تصوف کا پودا اوائل اسلام سے لے کر آج تک پھلتا پھولتا رہا ہے، اور یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔ مصنف نے تصوف کا عملی پہلو بھی پیش کیا ہے جس سے قارئین کو تصوف کے خدوخال سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ آخر میں مصنف نے تکمیل تصوف کے تحت شریعت طریقت، حقیقت اور معرفت کے بارے میں حقیقت پر مبنی باتیں کی ہیں۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے جدید دور میں تصوف کے احیاء کے لیے ایک گراں قدر کام کیا ہے انہوں نے بندے کو اپنے رب سے رابطہ قائم کرنے کی دعوت دی ہے جو کہ ایک لافانی اور آفاقی حقیقت ہے۔ اصل میں معرفت ہی وہ مقام

ہے جہاں پہنچ کر سالک کو اس حقیقت کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ ذات جو کنزاً مخفی تھی اس نے کیوں اپنے اظہار کے لیے اس کائنات کو بنایا جس میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جدید دور کے انسان کو روحانی تجربے کی دعوت دینا بذات خود ایک بہت بڑا کام ہے۔ میں اس دعوت دینے پر مصنف کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاگو ہوں کہ رب تعالیٰ اپنی رحمت سے مصنف کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور دنیا کی اس اندھیری رات میں یہ کتاب نور کی طرح ہر سو روشنی پھیلاتی چلی جائے۔

۷ مارچ ۱۹۹۹ء

ڈاکٹر شہزاد قیصر

سیکرٹری محکمہ تعلیم، حکومت پنجاب، لاہور

تعارف

"آئینہ تصوف" ------ سادہ اور عام فہم پیرائے میں صرف اس اعتراض کا جواب ہے جو معترضین کی طرف سے کیا جاتا ہے ----- کہ

"تصوف دین و شریعت سے ہٹ کر نظریات کا ایک ایسا مجموعہ ہے، جو یونان، ایران اور ہندوستان سے درآمد کر کے اسلام میں داخل کیا گیا ہے جس میں یونان کا فلسفہ، ایران کا ترک دنیا اور ہندوستان کا جوگیانہ پن شامل ہے۔"

اس اعتراض کی دو حیثیتیں ہیں

پہلی حیثیت میں یہ اعتراض ان لوگوں کی طرف سے ہے جو تصوف کی حقیقت سے ناواقف ہیں اور اس ناواقفیت کی بنا پر وہ مکمل طور پر اس کی تردید کرتے ہیں۔ ان کے سامنے تصوف کی وہی شکل ہے جو بعض لوگوں نے اسے دے دی ہے۔ اس طرح وہ شریعت کے اس حصے سے محروم رہ جاتے ہیں جس کی بدولت انہیں حقیقی کامیابی حاصل ہو سکتی تھی۔ اس محرومی کا وہ خود تو شکار ہوتے ہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دوسروں کو بھی محروم کر دیتے ہیں۔

دوسری حیثیت میں وہ لوگ آتے ہیں جو اس اعتراض کو صحیح سمجھ کر یقین کر بیٹھے ہیں کہ واقعی تصوف، شریعت سے الگ ایک لائحہ عمل ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ شریعت محمدیؐ اور تصوف دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ صوفی کا شریعت سے کیا واسطہ؟ ان لوگوں نے تصوف کو مافوق الفطرت، دیومالائی اور عقل سے ماورا حیثیت دے دی ہے اور صوفی صرف اسے ہی مانتے ہیں جو تارک الدنیا ہو، شریعت کا لبادہ اتار بیٹھا ہو۔ نماز روزے کی ضرورت محسوس نہ کرتا ہو، جنگلوں، ویرانوں، دریا کے کناروں یا کسی درگاہ کی دہلیز پر بیٹھا ہو۔ حالت استغراق میں رہتا ہو۔ جب بولے

تو تحکمانہ انداز میں جھڑک دے یا انتہائی عاجزانہ طریقے سے کوئی راز کی بات کہہ دے، کوئی پیش گوئی کر دے یا کوئی خوشخبری سنا دے۔ گھر بار اور شادی کی ضرورت محسوس نہ کرے۔ آبادی میں کبھی کبھی آئے پھر چلا جائے۔ مرشد کے لیے بھی ان لوگوں نے ایسا ہی تصور گھڑ رکھا ہے۔

میں نے مسلمانوں کے جن دو طبقوں کا ذکر کیا ہے دونوں ہی حقیقت ناآشنا ہیں۔ پہلا طبقہ تو تصوف کو مانتا ہی نہیں۔ دوسرا اگر مانتا ہے تو غلط انداز میں۔ میں نے کوشش کی ہے۔ کہ اس کتاب کے ذریعے تصوف کی اصل صورت واضح کر دوں تاکہ وہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں جو یا تو ناواقفیت کی بنا پر ذہنوں میں بیٹھ گئی ہیں یا پھر تصوف کو غلط انداز میں سمجھنے کی بنا پر موجود ہیں۔

تیسرا طبقہ وہ ہے جو تصوف کو صحیح انداز میں لیتا ہے کہ تصوف شریعت سے ہٹ کر نہ تو کوئی الگ مسلک ہے اور نہ طریقہ۔ بلکہ تصوف، شریعت کے احکامات کو انتہائی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ بجا لانے اور اطاعت میں اللہ کی محبت اور اس کے خوف کی روح بھر دینے کا نام ہے۔

یہ درست کہ تصوف کے نام پر کچھ لوگوں نے اپنی دکانیں چمکائی ہوئی ہیں اور وہ فریب نفس کا شکار ہو کر فنا ہو جانے والی دنیا کا مال و متاع حاصل کر رہے ہیں۔ خود تو دانستہ طور پر معصیت میں پڑے ہوئے ہیں لیکن سادہ لوح عوام کو جن میں اکثریت اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ لوگوں کی ہوتی ہے، گمراہ کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ ریاکار ہیں اپنی اصلیت چھپا کر دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں۔ صوفیانہ شکل و صورت بنا کر تصوف کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں اور کسی مزار کے گدی نشین بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اپنے چیلوں کے ذریعے چند کرامتیں مشہور کروا کر لوگوں کو متوجہ کر لیتے ہیں اور آنے والوں کو عجیب و غریب طریقوں سے نفسیاتی طور پر مسحور کر کے توہمات کی دلدل میں دھکیل دیتے ہیں جہاں سے وہ پھر نکل نہیں سکتے۔ جب ان نام نہاد پیروں فقیروں کے پول کھلتے ہیں تو پھر لوگ تصوف پر اعتراضات کرنے لگ جاتے

ہیں۔ صوفیاء کرام کو ان نام نہاد "پیروں فقیروں" کی طرح سمجھ کر مثالیں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ صوفیہ کے ساتھ بعض مافوق الفطرت اور غیر شرعی باتوں کو منسوب کر دیا گیا ہے۔ جن کی کوئی اصل نہیں۔ صوفیانہ شاعری میں بعض اشعار کے ظاہری معانی لے کر غلط مطلب اخذ کر لیا جاتا ہے۔ گو بعض اشعار قابل اعتراض بھی سمجھے جاتے ہیں لیکن انہی کو آڑ بنا کر پورے لائحہ عمل کو رد کر دینا انصاف نہیں۔

تصوف کے سادہ اور عام فہم مسلک کو فلسفیانہ رنگ دے کر ایسی پیچیدگیاں اور موشگافیاں پیدا کر دی گئی ہیں کہ پڑھے لکھے لوگ بھی اس کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ در حقیقت تصوف کا تو کوئی فلسفیانہ رنگ ہے ہی نہیں۔ یہ تو ایک ایسا عام فہم طریق کار ہے جو شریعت کے احکامات کو اخلاص کے ساتھ بجالانے اور ان کی حقیقت تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن عباسی خلفا کے عہد میں مختلف یونانی علوم کو عربی قالب میں ڈھالا گیا تو یونانی فلسفہ "نو افلاطونیت" کے اصولوں کو اسلامی تعلیمات میں گڈ مڈ کرنے کی کوششیں شروع کر دی گئیں۔ تو تصوف بھی فلسفیانہ رنگ آمیزی سے نہ بچ سکا۔ جس سے تصوف کے اندر عجیب و غریب پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ جو عوام کی سمجھ سے بالا تر تھیں۔ مسلمان فلاسفہ نے تصوف کے اندر یونان کے غیر اسلامی فلسفے کی خوامخواہ پیوند کاری کر کے اس میں ایسے الجھاؤ پیدا کر دیئے کہ جو بھی سلجھانے کی کوشش کرتا' مزید الجھ جاتا۔ لیکن حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور میں یہ الجھاؤ دور کر دیئے۔

اسی طرح ایرانی نظریات کو بھی تصوف میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایرانی مذہب مانی یا زندقہ کے پیروکار جب دنیائے اسلام میں بدنام ہو گئے تو انہوں نے اپنے اعتقادات یعنی ترک دنیا رہبانیت اور دوسرے مشرکانہ نظریات کو تصوف میں داخل کرنے کی کوشش کی لیکن ایرانی صوفیہ نے ان کا رد کیا اور تصوف کے نکھار کو میلا نہ ہونے دیا۔ ان میں امام غزالیؒ ' سنائی غزنویؒ ' فرید الدین عطارؒ '

شیخ ابو سعید ابی الخیرؒ اور عبدالرحمٰن جامیؒ جیسے اکابر صوفیاء شامل ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی ان باطل نظریات کا رد کرکے توحید خالص کا درس دیا۔

ہنود نے بھی اسلام دشمنی کے باعث تصوف پر حملے کئے۔ اور خاصی حد تک کامیاب بھی رہے۔ نظریہ حلول کو تصوف میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔ فنا کا غلط تصور پیش کیا۔ ترک دنیا کو یہ رنگ دیا کہ آبادی چھوڑ کر جنگلوں کی راہ لو۔ اپنے نفس کو ناقابل برداشت تکلیف دو۔ لباس ظاہری اتار کر محض ایک لنگوٹی باندھ لو۔ ان نظریات کو ہندو سادھوؤں نے پھیلایا اور اس بات کا پرچار کیا کہ رام اور رحیم ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں۔ ہندوؤں کا اولیاء کرام کے مزاروں پر حاضری دینے کا ایک مقصد یہ بھیٔ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں روحانیت اور تصوف کے لحاظ سے کوئی فرق باقی نہ رہے۔ ہندوؤں نے رخ تصوف پر جو گرد جما دی تھی اسے امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی فاروقی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی مساعی جمیلہ سے صاف کیا۔

آج پندرھویں صدی ہجری میں تصوف کے ماہ تاباں پر بدعات، توہمات، حرص و ہوا اور ریاکارانہ صوفیانہ پن کے سیاہ بادل بری طرح چھا چکے ہیں، جس کی وجہ سے روحانیت کے نور پر مادہ پرستی کے تاریک سائے پھیل گئے ہیں۔ اندھیروں میں کچھ سجائی نہیں دے رہا۔ روحانیت کا متلاشی ان اندھیروں میں ہاتھ پاؤں مار مار کر تھک جاتا ہے اور مایوس ہو کر اس نور کی تلاش ترک کر دیتا ہے جس کی تڑپ اس کے دل میں موجود تھی۔ پھر یا تو وہ انہی اندھیروں کا ایک حصہ بن جاتا ہے یا توہمات اور بدعات کے کسی گڑھے میں گر جاتا ہے۔ اصل میں مادئیت اس حد چھا چکی ہے کہ ہم اس کی چمک دمک میں کھو کر رہ گئے ہیں۔ شیطان نے اپنے فریب کے جال بڑے دلکش انداز میں بُن لئے ہیں اور وہ ان کے استعمال کے لیے دور جدید کے تمام آلات اور حربے بلا تکلف استعمال کر رہا ہے۔ اس دور میں اس کی آوازیں، ترغیبات اور

دلفریبیاں اس حد تک موثر ہو گئی ہیں کہ بسا اوقات علماء کا اپنی علمیت و فقاہت اور صوفیا کا اپنے تقویٰ و طہارت کو قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ دور انتہائی آزمائش کا دور ہے۔ علماء و صوفیاء کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں لیکن علم و تقویٰ کے مراکز اپنی افادیت کھو رہے ہیں۔ تصوف' جس کی بنیاد عمل پر رکھی گئی ہے اسے محض چند رسومات کا مجموعہ بنا کر دکھایا جا رہا ہے۔ جس سے شکوک و شبہات پیدا ہو چکے ہیں۔

لوگ نام نہاد پیروں فقیروں کی سنی سنائی باتوں' رسمی سجادہ نشینوں کے شریعت سے ماورا طور طریقوں خانقاہوں اور درباروں کے رسمی ماحول' میلوں ٹھیلوں اور ان میں ہونے والی بدعات اور غیر شرعی حرکتوں کو دیکھ کر تصوف کے بارے میں ذہن کے اندر ایک ایسا خاکہ تیار کر لیتے ہیں جس میں انہیں شریعت نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اس طرح وہ یہی سمجھتے ہیں کہ واقعی تصوف محض چند رسومات کا مجموعہ ہے جس پر عمل کرنے کی قرآن و سنت میں کوئی اجازت نہیں آئی--- اس طرح کچھ لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ صحابہ کرامؓ کے بعد صوفیاءؒ نے کس طرح حضور نبی کریم ﷺ کے فیض کو آگے پہنچایا' دین و شریعت کی تبلیغ و ترویج اور لوگوں کے تزکیہ قلوب اور اصلاح معاشرہ کے لیے دن رات جدوجہد کی' بغیر تحقیق کیے تصوف کی نفی کر دیتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے ایسے ہی نام نہاد "تصوف" کو اپنا لیا اور ایسی غیر شرعی حرکات اور باتوں کو نعوذ باللہ معرفت کی باتیں کہہ دیا---

ان دونوں طبقوں کے لیے اس کتاب کا یہ آئینہ پیش خدمت ہے۔

جس میں تصوف کا اصلی چہرہ پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے۔

آیئے --- دیکھئے---- اور ان بھول بھلیوں اور توہمات کے طلسم سے نکل آیئے جس نے ہمارے دل و دماغ جکڑ رکھے ہیں۔

۲۳ ستمبر ۱۹۹۸ء — ضیاء الحسن فاروقی شیخوپورہ

انتساب

میں اس فکری کاوش کو

شیخ و مرشد حضرت خواجہ **محمد** معصوم رحمۃ اللہ علیہ (موہری شریف)

اور خلیفہ مجاز والد گرامی حضرت حکیم سلطان احمد فاروقی رحمۃ اللہ علیہ

کے نام منسوب کرنے کا اعزاز حاصل کرتا ہوں۔

○

باب - ۱

تمہید

روح عبادت

اللہ تعالیٰ نے تخلیق انسان سے پہلے کائنات کی تخلیق فرمائی- جس وسیع و عریض زمین پر انسان کو اپنا خلیفہ بنایا اسے جمادات' نباتات اور حیوانات سے رونق بخشی- آسمان دنیا کو ستاروں سے مزین فرمایا- روشنی اور حرارت کے لیے سورج اور چاند بنائے- زندگی کی نشوونما کے لیے ہوا' پانی اور خوردونوش کے لیے طرح طرح کے کھانے بنائے- اور ایسے تمام ذرائع پہلے ہی سے موجود کر دیئے جن کی انسان کو ضرورت تھی- تاکہ انسان اپنے خالق سے یہ شکوہ نہ کر سکے کہ اے رب العزت! مجھے تخلیق تو کر دیا لیکن میں زندگی کہاں اور کیسے بسر کروں؟ ان تمام ذرائع کو استعمال میں لانے کے لیے عقل جیسی نعمت سے نوازا- اور ایسی خوبیاں عطا کیں جن کی وجہ سے انسان دوسرے جانداروں سے ممتاز ہوا- اور اشرف مخلوق ٹھہرا- قوت ادارک' فہم و فراست' بصیرت' نیکی اور بدی میں امتیاز پیدا کرنے کی صلاحیت' بدنی قوت' جرات' حوصلہ' ولولہ اور جذبات و احساسات ایسی بے مثال خوبیوں کے ساتھ ساتھ بہترین شکل و صورت بھی عطا کی-

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

"اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو انہیں (ہرگز) شمار نہ کر سکو گے بے شک اللہ بخشنے والا' مہربان ہے-" (القرآن ۱۶:۱۸)

اللہ تعالیٰ نے اپنی ساری کائنات صرف انسان کے لیے پیدا کی- لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو کس لیے پیدا کیا گیا؟ ---- اس سوال کا جواب

قرآن حکیم میں بڑے واضح انداز میں دیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ

"میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا" (القرآن ۵۱: ۵۶)

مزید فرمایا "وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ"

"اور آپؐ کے رب نے حکم فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو" (القرآن ۱۷: ۲۳)

یہ بات تو مصدقہ ہو چکی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف اپنی ہی عبادت کے لیے پیدا کیا لیکن اب ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبادت ہے کیا؟

اسلام میں عبادت کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ ایسی وسعت اور کسی مذہب میں نہیں ملتی۔ کیونکہ اسلام میں عبادت صرف پوجا پاٹ ہی نہیں کہ دوسرے مذاہب کی طرح ایک تصور کو سامنے رکھ کر رکوع و سجود میں مصروف ہو گئے۔ اور معبود کو انسانی اوصاف کا پیکر سمجھ کر اس کے سامنے اس طرح ہاتھ جوڑے جائیں' خوشامد کی جائے کہ وہ خوش ہو کر ہماری مشکلات حل کر دے یہ عبادت کا مشرکانہ اور جاہلانہ تصور ہے۔ اور نہ ہی اسلام میں عبادت کے کسی ایسے تصور کی گنجائش ہے' کہ انسان دنیا کی زندگی سے الگ تھلگ ہو کر ایک کونے میں بیٹھ کر یا ویرانوں میں جا کر اللہ کو یاد کرے اور دنیاوی ذمہ داریوں سے کنی کترا کر نفس کشی اور ریاضت سے اپنی روحانی ترقی کے لیے کوشاں رہے یہ راہبانہ تصور عبادت ہے اسلام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کیونکہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

اللہ کی یاد

اسلامی عبادت کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ انسان صرف اللہ کا بندہ ہے۔ اور بندہ بھی ایسا کہ جو بلاچوں و چرا اس کے احکامات کو بجا لائے۔ اور ایسی فرمانبرداری کرے کہ اسے کسی دوسرے کی بندگی کی ضرورت نہ رہے۔ ہم نے عبادت کے

مفہوم کو محدود کر رکھا ہے۔ کہ عبادت تو صرف نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ میں ہے حالانکہ یہ عبادتیں تو انسان کو اس بڑی عبادت کے لیے تیار کرتی ہیں جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اور وہ بڑی عبادت ہے ----- "اللہ کی یاد" - کیونکہ جب تک اللہ کی یاد دل میں رہے گی انسان کوئی گناہ نہیں کرے گا۔ انسان جب اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی انسان کو نظرانداز کر دیتا ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

"اور ان جیسے نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو (اللہ نے انہیں آزمائش میں ڈالا) انہیں اپنا آپ بھی یاد نہ رہا وہی فاسق ہیں۔" (القرآن ۵۹ : ۱۹)

مزید فرمایا: "فَاذْكُرُوْنِىْٓ اَذْكُرْكُمْ"

"تم مجھے یاد کرو۔ میں تمہیں یاد کروں گا" (القرآن ۲ : ۱۵۲)

پس عبادت کی روح اللہ کی یاد ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے ہم نماز کی مثال دیتے ہیں۔ دن رات میں اللہ تعالیٰ نے پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں۔ اللہ کے حضور سر تسلیم خم کرنے والا مومن جب نماز فجر کے وقت اللہ کی بارگاہ میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ قیام، رکوع و سجود میں اس کی تسبیح بیان کرتا ہے۔ اس کی کبریائی کا ذکر کرتا ہے۔ پھر بڑی عاجزی سے اللہ کے حضور دعا مانگتا ہے۔ اور روز مرہ کے کام کاج میں مشغول ہو جاتا ہے۔ وہ نماز ظہر تک دنیا کے معاملات میں مصروف رہتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نماز فجر سے لے کر نماز ظہر تک اس کا وقت کس طرح گزرا۔ اسے اللہ یاد رہا یا وہ اللہ کو بھول گیا۔ اگر تو اسے اللہ یاد رہا۔ تو وہ عبادت کی روح کو سمجھ گیا۔ اور اگر اللہ کی یاد سے دور رہا تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اس مقصد کو بھول گیا ہے جس کے لیے اس کے رب نے اسے پیدا کیا۔ اللہ کی یاد کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر اس چیز کو بھول جائے جو اسے اللہ سے غافل کر دینے والی ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں اتنا آگے بڑھ جائے کہ اللہ کی معمولی سی ناراضی کا خوف بھی اس کے دل

میں ہر وقت موجود رہے۔ جب یہ بات پیدا ہو جائے گی تو بندہ معمولی گناہ کو بھی بہت بڑا سمجھے گا اور معمولی نیکی کے لیے بھی فکر مند رہے گا۔ اسے یاد رہے گا کہ نماز فجر میں وہ اللہ کی بارگاہ میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کی حمد و ثنا کی تھی۔ اب دنیا میں نکلا ہے تو اللہ کی اس یاد کو اپنے دل کی بستی میں آباد رکھے اور جب ظہر کی نماز ادا کرے گا تو عصر تک یہی کیفیت رہے گی اسی طرح عصر سے مغرب تک' مغرب سے عشاء تک اور پھر عشاء سے فجر تک جب یاد الٰہی کا تکرار ہو گا تو وہ کوئی بھی کام ایسا نہ کر سکے گا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضی کا باعث ہو گا اور وہ ہر وہ کام کرے گا جس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوبؐ کی رضا شامل ہوگی۔ جب یہ کیفیت اس کی عادت بن جائے گی تو پھر اس کا کھانا پینا' چلنا پھرنا' گفتگو کرنا' حتیٰ کہ سونا بھی عبادت بن جائے گا۔ یہی وہ عبادت ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ اور انسان کے لیے کائنات کی ہر چیز بنائی۔

یہی مثال روزہ' حج اور زکوٰۃ کی ہے۔ ہادی برحق ﷺ نے اس کی وضاحت بڑے واضح انداز میں اس طرح فرمائی ہے۔

کم من صائم لیس له من صیامه الا انطماؤ۔ کم من قائمه لیس له من قیامه الاسهر

"کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں۔ کہ روزے سے بھوک و پیاس کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اور کتنے ہی راتوں کو قیام کرنے والے ایسے ہیں جنہیں اس قیام میں رت جگے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" (سنن دارمی)

ایسا شخص جو روزہ رکھنے کے باوجود متقی نہ بن سکے اور نماز ادا کرنے کے باوجود برے اور بے حیائی کے کاموں سے نہ بچ سکے' غافلوں میں شمار ہو گا۔ اس کا اللہ کی یاد سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ اگر اسے اللہ یاد رہتا تو اس کی نماز اور روزہ وہی نتائج برآمد کرتے جن کی نشاندہی قرآن حکیم میں کر دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

تَتَّقُوْنَ"

"تم پر روزے فرض کئے گئے۔ جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے۔

تاکہ تم متقی بن جاؤ" (القرآن ۲: ۱۸۳)

نماز کے بارے میں آگاہ فرمایا:

"اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ"

"یقیناً نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔" (القرآن ۲۹: ۴۵)

"فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ" کا یہی مفہوم ہے

یہی وہ دائمی ذکر الٰہی ہے۔ اور اس دائمی ذکر کرنے والوں کی نشاندہی قرآن حکیم نے اس طرح کی ہے۔

"رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ"

"وہ مرد جنہیں اللہ کے ذکر سے کوئی تجارت اور خرید و فروخت غافل نہیں کرتی۔"

(القرآن ۲۴: ۳۷)

قرآن حکیم کی ان تمام وضاحتوں کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم محسن انسانیت، سرور کائنات نبی رحمت ﷺ کی تریسٹھ سالہ حیات طیبہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں سرزمین حجاز پر ایک ایسی عظیم الشان، اعلیٰ و ارفع، بے مثال، منفرد اور متوازن شخصیت نظر آتی ہے جو منبع جود و سخا، مربی، مشفق اور ہمہ صفت موصوف ہے۔ اور معاشرے میں ہر فرد کے اتنی قریب ہے کہ اس شخصیت کا ایک ایک پہلو، ایک ایک لمحہ اور ایک ایک اشارہ اس طرح واضح صاف اور عیاں ہے جس طرح دن کے وقت چمکتا دمکتا سورج اور رات کے وقت ماہ تاباں۔

اگر آپؐ کی تریسٹھ سالہ عمر مبارک کا تجزیہ کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی زندگی کے ترپن (۵۳) سال مکہ مکرمہ میں بسر کئے ہیں اور آخری دس (۱۰) سال مدینہ منورہ میں۔ نبوت سے قبل چالیس سالہ حضورؐ کی حیات طیبہ ایک نوجوان تاجر ہمدرد و مونس خاوند اور مشفق باپ کی تھی۔ نیز ضلالت و گمراہی کے اس

گندے معاشرے میں حضورؐ کی حیثیت صادق و امین کی تھی۔ ظلم و بربریت ' شرک اور فسق و فجور کے درمیان آپؐ اعلیٰ صفات اور بلند اخلاق و کردار کی روشنی کے مینار تھے۔ مکہ کے اس برے معاشرے سے حضورؐ نے کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔ بلکہ چالیس سال تک ان کے سامنے ایک مثالی انسان کا نمونہ پیش کیا۔ نبوت کے بعد مصائب اور کٹھن حالات میں رہ کر تیرہ (۱۳) سال کمال صبر و استقامت کے ساتھ اسی معاشرے میں شب و روز بسر کیے۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں دس سال کی مصروف ترین زندگی آپؐ نے بسر کی۔ کبھی مسجد ہے ' کبھی بدر و حنین کا میدان جہاد ہے۔ کبھی نماز شبانہ ہے اور کبھی بازار تجارت ہے۔ کبھی ازواج مطہرات کے حجرے ہیں اور اصحاب صفہ کا کچا صحن ہے۔ کبھی یہود اور منافقین کی سازشیں ہیں اور کبھی صحابہ کرامؓ کی بارونق محفلیں ہیں ...... غرض اسی معاشرے میں گھل مل کر رہے۔ زندگی کی اس مصروفیت میں بھی------

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ کا ایسا مصداق بنے کہ حق تعالیٰ کو کہنا پڑا۔ اے لوگو!

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ"

"بیشک رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ موجود ہے"

(القرآن ۳۳:۲۱)

یہ ہے وہ عبادت جس کے لیے انسانیت کی تخلیق کی گئی۔

اللہ کے مخلص بندے

اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو اس زمین پر اپنا خلیفہ بنایا تو یہ بات ابلیس کو بہت ناگوار گزری۔ وہ حاسد بن گیا اور حسد کی آگ میں جل اٹھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ تو تمام فرشتے سجدے میں گر گئے سوائے ابلیس کے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دیکھ کر ابلیس سے پوچھا۔

"يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ"

"اے ابلیس! تجھے کس چیز نے منع کیا اس کو سجدہ کرنے سے جسے میں نے اپنے

ہاتھوں سے بنایا"

"قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ"

"(ابلیس) بولا۔ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے مٹی سے تخلیق کیا"

"قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ○ وَ اِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ"

"(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا (اے بے ادب) نکل جا یہاں سے تو مردود ہے۔ اور بلاشبہ تجھ پر قیامت تک لعنت ہے۔"

"قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ"

"کہنے لگا۔ اے میرے رب۔ پھر مجھے اس دن تک مہلت دے جب (مرے ہوئے) اٹھائے جائیں گے۔"

"قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ○ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ"

"(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا۔ (ٹھیک ہے) تو ان میں سے ہے جنہیں اس وقت معلوم کے دن تک مہلت دی گئی"

ابلیس کو قیامت کے دن تک مہلت مل گئی تو وہ انسان کے لیے آزمائش بن گیا۔ جس بشر کی وجہ سے وہ راندہ درگاہ ہوا تھا اسی کے درپے ہو گیا اور یہ سن کر بولا۔

"فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ۔"

"تیری عزت کی قسم۔ میں ضرور ان سب کو گمراہ کر دوں گا۔ مگر ان میں سے جو تیرے مخلص بندے ہوں گے۔ (ان پر میرا داؤ نہیں چلے گا)" (قرآن ۳۸ : ۷۵ - ۸۳)

اس وقت سے لے کر آج تک نیکی اور بدی میں جنگ جاری ہے۔ اور اولاد آدم دو گروہوں میں بٹ گئی ہے ایک گروہ حزب اللہ اور دوسرا حزب الشیطن۔

اب حزب اللہ میں اللہ کے مخلص بندے شامل ہو گئے۔ جن پر شیطان کا کوئی بس نہیں چلتا۔ اور حزب الشیطٰن میں وہ لوگ شامل ہو گئے۔ جو شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔ اور جب ہم نے قرآن سے پوچھا کہ شیطان کی پیروی کون لوگ کرتے ہیں۔ تو ہمیں جواب ملا۔ جو اللہ کے ذکر سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ "وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ"

"اور جس نے منہ موڑا رحمٰن کے ذکر سے۔ ہم اس پر ایک شیطان تعینات کرتے ہیں کہ وہ اس کا ساتھی رہے" (قرآن ۴۳: ۳۶)

مزید جواب ملا۔

"اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ"

"ان پر شیطان غالب آ گیا۔ تو انہیں اللہ کی یاد بھلا دی۔ وہ شیطان کے گروہ ہیں۔ خبردار بیشک شیطان ہی کا گروہ خسارے میں ہے" (القرآن ۵۸: ۱۹)

سورۃ المجادلہ کی اس آیت نے بڑے ہی واضح اور جامع انداز میں شیطان کے گروہ کی نشاندہی کی اور اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ انسان جب اپنے مقصد تخلیق کو بھول جاتا ہے تو وہ شیطان کے گروہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ تخلیق انسان کے مقصد کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے کہ وہ اللہ کی یاد ہے۔ اور یہی عبادت کی روح ہے تو ثابت یہ ہوا کہ مخلصین وہی عباد الرحمٰن ہیں جو اللہ کی یاد کو قائم رکھتے ہیں اور کسی لمحے بھی اس سے غافل نہیں ہوتے اور ان پر شیطان کا کوئی داؤ نہیں چلتا۔ جنہوں نے اللہ کو یاد رکھا وہ اللہ کے گروہ میں شامل ہوئے اور جنہوں نے خالق کی یاد کو فراموش کر دیا وہ شیطان کے گروہ میں شامل ہو کر گمراہ ہوئے۔ اور سراسر نقصان اور خسارہ اٹھانے والوں میں شمار ہوئے۔ اب کامیابی کن لوگوں کو ہے اور فلاح پانے والے کون ہیں؟

ارشاد ہوا:

"اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَ يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"

"یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں (اللہ نے) ایمان نقش کر دیا۔ اور اپنی طرف سے روح کے ذریعے ان کی مدد کی۔ اور انہیں اس جنت میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔ یہ اللہ کا گروہ ہے۔ خبردار۔ بیشک اللہ ہی کا گروہ فلاح یافتہ ہے۔"

(القرآن ۵۸ : ۲۲)

ہمیں قرآن حکیم کے ذریعے اللہ تعالٰی کے گروہ کا بھی پتہ چل گیا اور شیطان کے گروہ کا بھی علم ہو چکا اب ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ وہ مخلصین کون سے ہیں جن پر شیطان کا جادو بھی بے اثر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ خوش نصیب حزب اللہ ہی میں شامل ہیں۔ قرآن حکیم سے جب راہنمائی حاصل کی۔ تو ارشاد ہوا۔

"اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ○ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ○ "

"بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا۔ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے۔ ان پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے۔ (وہ کہتے ہیں) کہ نہ خوف کھاؤ اور نہ غم کرو۔ اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی وجہ سے جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا تھا۔ ہم تمہارے دوست ہیں دنیاوی زندگی میں اور آخرت میں بھی۔ اور تمارے لیے اس میں ہے جو تمہارا جی چاہے۔ اور تمہارے لیے اس میں جو مانگو۔ مہمانی بخشنے والے رحم کرنے والے کی

طرف سے۔" (قرآن ۴۱: ۳۰۔ ۳۲)

تو پتہ چلا کہ مخلصین وہی ہیں۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مان کر یاد رکھا اور اس یاد کو ہمیشہ کے لیے تر و تازہ رکھا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام کیا۔

"اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيۡقًا"

"جن پر اللہ نے انعام کیا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہدا اور صالحین یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں!" (قرآن ۴: ۶۹)

یہی اللہ کے مطیع و فرمانبردار بندے ہیں۔ جن کے بارے میں قرآن حکیم نے خبردار کیا۔

"اَلَآ اِنَّ اَوۡلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ۝ اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ كَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ ۝ لَهُمُ الۡبُشۡرٰى فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَ فِى الۡاٰخِرَةِ لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ"

"خبردار! اللہ کے ولیوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم۔ وہ جو ایمان لائے اور متقی ہیں۔ انہیں خوشخبری ہے اس دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی اللہ کی باتیں تبدیل نہیں ہوا کرتیں۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔" (۱۰: ۶۲۔ ۶۴)

مخلصین کی اس جماعت کا طریق کار کیا ہے۔ کون سا مسلک ہے جس پر یہ نفوس قدسیہ گامزن ہیں۔؟ وہ ہے اخلاص للہ اور توجہ الی اللہ۔۔۔۔

"وَمَآ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ۵ حُنَفَآءَ وَ يُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُؤۡتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيۡنُ الۡقَيِّمَةِ"

"اور نہیں حکم دیا گیا تھا انہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ بالکل یکسو ہو کر۔ اور قائم کرتے رہیں نماز اور ادا کرتے رہیں زکوٰۃ اور یہی نہایت سچا دین ہے۔" (قرآن ۹۸: ۵)

یہی راہ اخلاص ہے۔ جس پر اللہ کے مخلص بندے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ یہی صراط مستقیم ہے۔ یہی مسلک حقہ ہے اور اسی کو "تصوف" کا نام دیا گیا ہے------ اس کی نشاندہی خود ہادی برحق، رحمت دو عالم، نبی معظم ﷺ نے کی ہے، حکم ہوتا ہے۔

"قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ○ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ"

"(اے نبیؐ) فرما دیجیے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کروں اور مجھے (یہ بھی) حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے سر تسلیم خم کرنے والا میں خود بنوں" (قرآن ۳۹: ۱۱ - ۱۲)

مزید فرمایا

"اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ رَبِّیْ وَ رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمًا"

"بیشک اللہ میرا اور تمہارا رب ہے۔ پس اسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے"

(قرآن ۴۳: ۶۴)

اس تمام گفتگو سے جو نکات واضح ہوتے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو صرف انسان کے لیے پیدا فرمایا:
☆ انسان کو محض اپنی عبادت کے لیے تخلیق کیا۔
☆ عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ مگر عبادت کی روح "یاد الٰہی" ہے۔
☆ عبادت کا خلاصہ ---- فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ ہے۔
☆ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ اللہ کی یاد کو تر و تازہ رکھتے ہیں۔
☆ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور اسوہ حسنہ یہ ہے کہ دنیا میں گھر کر اللہ کو یاد رکھو۔
☆ تخلیق آدم کے فوراً بعد اولاد آدم دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک حزب اللہ دوسرا حزب الشیطان۔

☆ حزب اللہ میں اللہ کے مخلص بندے ہیں جن پر شیطان کا داؤ نہیں چل سکتا۔

☆ حزب الشیطٰن میں وہ لوگ شامل ہو گئے جنہوں نے اللہ کی یاد کو بھلا دیا۔

☆ مخلصین وہ نفوس قدسیہ ہیں جنہوں نے کہا۔ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس پر قائم رہے۔

☆ یہ صالحین کی جماعت ہے۔ جس پر اللہ نے اپنا انعام کیا۔

☆ اور یہی اولیائے کرام ہیں۔ جو صراط مستقیم پر ہیں۔

☆ اور وہ صراط مستقیم جس پر یہ اولیائے کرام ہیں وہ راہ تصوف ہے۔

☆ اس راہ کی نشاندہی خود ہادی برحق ﷺ نے کی ہے۔

☆ اور یہی دین قیم ہے۔

○

باب - ۲

حقیقت تصوف

تصوف کیا ہے؟

معلم انسانیت، نبی رحمت حضرت محمد ﷺ ہمارے لیے ایک ایسا دین قیم لے کر مبعوث ہوئے جس میں ایک مکمل اور جامع نظام زندگی موجود ہے۔ اس نظام کی بنیاد وحی الٰہی پر رکھی گئی ہے نہ کہ انسانی عقل و فکر پر۔ کیونکہ خالق ہی اپنی مخلوق کی حاجات، ضروریات اور احوال کو بہتر طریقے سے جان سکتا ہے۔ وہ نفس انسانی کا خالق ہونے کے ناطے انسان کی نفسیات سے آگاہ ہے۔ وہی علیم و خبیر اور سمیع و بصیر ہے۔ اس خالق حقیقی نے اس دین قیم کے اندر نہ صرف انسان کی مادی، جسمانی اور تمدنی ضروریات کی تکمیل کا سامان مہیا کیا ہے بلکہ اس کی روحانی، اخلاقی اور تہذیبی حاجات کی تکمیل کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ اور مرشد حقیقی، ہادی برحق حضور نبی کریم ﷺ کو ایک ایسی معتدل شریعت عطا فرمائی جس نے اس نظام زندگی کو نہ صرف آسان اور سہل بنا دیا بلکہ اس میں قیامت تک کے لیے ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی رکھ دی گئی، جس میں وہ تمام راہنما اصول موجود ہیں جو انسانی زندگی کے ہر گوشے کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ تمام شعبہ ہائے زندگی میں راہنمائی ملتی ہے اور ہمارے مسائل کا حل موجود ہے خواہ وہ معاشرتی ہوں یا معاشی، سیاسی ہوں یا قانونی تہذیب و تمدن سے متعلق ہوں یا اخلاقیات سے خواہ انفرادی، اجتماعی، قومی یا بین الاقوامی ہوں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ شریعت محمدیؐ ہر دور میں موجود اس کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے۔ اس لیے سورہ بقرہ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ------

"اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔" (آیت: ۲۰۸)

یہ دین اسلام جس میں ہمارے لیے زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے چار حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ عقائد ۲۔ عبادات ۳۔ معاملات ۴۔ اخلاقیات

عقائد میں ایمانیات' عبادات میں ارکان اسلام' معاملات میں حقوق العباد اور اخلاقیات میں تزکیہ نفس اور سیرت و کردار کو سنوارنا شامل ہے۔ قرآن حکیم میں حضور رسالت مآب ﷺ کی بعثت کے بھی چار مقاصد بیان فرمائے گئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

" هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ "

" وہی (اللہ) جس نے امیوں میں ایک رسولؐ انہی میں سے مبعوث فرمایا۔ جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ اور ان کا تزکیہ (نفس) کرتا ہے۔ اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔" (قرآن ۶۲: ۲ - ۲)

اس آیت کریمہ کی رو سے معلم انسانیت ﷺ کی بعثت کے جن چار مقاصد کی وضاحت ملتی ہے۔ وہ حضورؐ کے فرائض رسالت بھی ہیں۔ ان میں پہلا فرض آیات کی تلاوت ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکامات آیات کی صورت میں نازل ہوئے حضورؐ ان کو پڑھ کر سناتے۔ رسالت کا دوسرا فرض یہ تھا کہ ان آیات کو سن کر جو خوش نصیب مسلمان ہو جاتا' حضورؐ اسے اپنی تربیت میں لے کر اس کا تزکیہ نفس کرتے۔ اس کے باطن میں جو آلائشیں' نفسانی خواہشات وسوسے اور توہمات وغیرہ ہوتے ان کو اپنی صحبت اور نظر کرم سے دور کرتے۔ اس کے قلب سے یہ سب کچھ نکال کر اللہ کی یاد بھر دیتے۔ ذکر الٰہی سکھاتے اور ہر صحابیؓ کی طبیعت اور رجحان کو دیکھ کر اس کا روحانی تزکیہ فرماتے۔ جب قلب کی صفائی ہو جاتی تو حضورؐ

کتاب اللہ کی تعلیم دیتے یہ حضورؐ کا تیسرا فریضہ رسالت تھا۔ اس کے بعد حکمت بھری باتوں سے قرآنی آیات کی تشریح و توضیح فرماتے۔ اس طرح بعثت کے چاروں مقاصد پورے ہوئے اور رسالت کے فرائض بھی ادا ہوئے۔

جب انسان، مسلمان بنتا ہے تو وہ سب سے پہلے پانچ باتوں پر ایمان لاتا ہے۔ جنہیں عقائد یا ایمانیات کہتے ہیں۔ اللہ پر ایمان، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان۔ اس کے بعد وہ عبادات میں مشغول ہوجاتا ہے جن کی بہترین صورت نماز، روزہ حج اور زکوٰۃ ہے۔ یعنی وہ ارکان اسلام ادا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا تعلق معاشرے کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ والدین، بیوی بچے، رشتہ دار، ہمسائے، دوست احباب اور عوام الناس، مختلف معاملات میں ان کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔ اب اگر تو وہ اخلاق کا اچھا ہے، ہر ایک سے حسن سلوک سے پیش آتا ہے پھر تو اس کے تمام اعمال قبول ہو جائیں گے۔ اور حقوق اللہ میں کچھ کمی رہ بھی گئی ہو گی تو اللہ تعالیٰ حقوق العباد کی بہتر ادائیگی کے طفیل اس کمی کو پورا کر دے گا۔ اور اگر خدانخواستہ اس کا اخلاق برا ہے اور وہ ہر ایک سے بدسلوکی اور بدخلقی سے پیش آتا ہے تو ایسا شخص نہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ہاں قابل التفات ہے اور نہ معاشرے میں اسے اچھا سمجھا جائے گا۔ سب لوگ اسے نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھیں گے۔ اسی لیے حضور نبی رحمت ﷺ نے فرمایا تھا۔ ”تم میں بہترین وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں (صحیح بخاری)

اگر بغور دیکھا جائے تو تمام عقائد، عبادات اور معاملات کا دارومدار اچھے اخلاق پر ہے۔ بلکہ عبادات کی قبولیت ہی حسن خلق پر ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں ”بخل اور بدخلقی کسی مسلمان کے اندر جمع نہیں ہو سکتے (ترمذی - ابوداؤد - بخاری) اور اپنی ذات کے بارے میں حضور نے فرمایا۔ کہ ---- (اللہ تعالیٰ نے) مجھے صرف اس لیے مبعوث کیا ہے کہ میں اخلاق حسنہ کی تکمیل کر دوں۔“

پتہ یہ چلا کہ اسلامی دستور حیات کے تمام اصول و قواعد حسن اخلاق پر

اٹھائے گئے ہیں جن کی تکمیل کے لیے حضورؐ تشریف لائے۔ نیز قرآن حکیم نے بھی اس کی وضاحت فرما دی۔ کہ اے رسولؐ ---- اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (قرآن ۶۸ : ۴)

"بے شک آپؐ تو خلق عظیم کے مالک ہیں"

پس دین قیم کی تکمیل حسن خلق پر ہو گی۔ اور حسن خلق کو پیدا کرنے کے لیے تزکیہ نفس کی ضرورت پڑے گی۔ اور تزکیہ نفس کے بغیر کتاب و حکمت کی تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ وہ تعلیم موثر نہیں ہو گی۔ سنت نبویؐ بھی یہی ہے کہ سب سے پہلے آیات کی تلاوت، پھر تزکیہ نفس اس کے بعد کتاب و حکمت کی تعلیم۔

زمین زرخیز ہو گی تو بیج اچھے انداز میں اگ سکے گا۔ اور پھلے پھولے گا۔ اگر زمین ہی بنجر اور شور زدہ ہو تو اعلیٰ قسم کا بیج بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ یہی صورت حال انسانی قلب کی ہے۔ جہاں سے ایمان کا نور اور تقوے کی روشنی پھوٹتی ہے۔ جب تک قلب کا تزکیہ نہیں ہو گا، کتاب و حکمت کی تعلیم بے اثر ثابت ہو گی۔ ان تمام باتوں کی وضاحت اس کتاب میں مختلف مقامات پر کی گئی ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن میں جو مقصد "تزکیہ و حکمت" کے الفاظ میں بیان ہوا ہے اسی مقصد کے حصول کا نام "تصوف" ہے۔ یا یوں سمجھ لیں کہ جس مقصد کے حصول کے لیے تزکیہ نفس کرایا جاتا ہے اسی کو "تصوف" کہتے ہیں۔ حدیث نبوی کو رو سے اس کے لیے "احسان" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

"اَنْ تَعْبُدُ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ"

"احسان یہ ہے کہ ---- "تو اللہ کی عبادت (اس طرح) کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے نہیں دیکھ پاتا پس تحقیق وہ تو تجھے دیکھتا ہی ہے۔" (صحیح بخاری)

یہ ہے رجوع الی اللہ ۔ جو تصوف کی بنیاد ہے۔ اس فرمان رسالتؐ میں اس حقیقت کو بڑے جامع انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔ کہ عبادت کی روح جو "یاد

الٰہی" ہے اس کا مقام تو یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت اس طرح کرے کہ تو اللہ کو اپنے سامنے دیکھے۔ جب رجوع الی اللہ کا یہ عالم ہو تو پھر عبد اور معبود کے قرب کا کیا مقام ہو گا! یہی نا کہ "میں اس (بندے) کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور میں ہی اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے"

اور اگر یہ مقام قرب تاحال نصیب نہیں ہوا تو اتنی توجہ اور احساس تو ہو کہ میرا معبود مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہ بصیر ہے اور مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ بندہ اپنے رب کے حضور کبھی حالت قیام میں ہے کبھی رکوع اور کبھی سجدے میں ہوتا ہے لرزاں و ترساں خوف الٰہی کی وجہ سے۔ یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اور نہ ہی ایسا مقام یونہی مل جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے حدیث احسان میں عبادت کی حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔ تصوف کا یہی کام ہے کہ وہ سالک کو حدیث احسان کا مصداق بنا دیتا ہے۔ اور اگر ان دونوں حیثیتوں میں سے کوئی بھی حیثیت نہیں ملی تو سمجھ لیں عبادت وہ حقیقی عبادت نہیں جو اللہ کو مطلوب ہے بس محض جسمانی حرکات کا مجموعہ ہے جو قابل قبول نہیں۔ اس کی وضاحت کے لیے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

عبادت کی دو صورتیں ہیں۔ ظاہری صورت اور باطنی صورت۔

ظاہری صورت یہ ہے کہ اگر نماز ہے تو کیا نماز کی ادائیگی اسی طرح کی گئی ہے جس طرح اس کے ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے؟ یعنی قیام' رکوع اور سجود۔ یہ نماز میں جسم کا ظاہری عمل ہے۔ لیکن نماز کی باطنی صورت یہ ہے کہ نماز پڑھنے والے کی قلبی کیفیت کیا ہے؟ کیا جسم کے ساتھ دل بھی جھکا ہے کہ نہیں۔ اس قلبی کیفیت سے جو چیز بحث کرتی ہے وہ تصوف ہے۔ تصوف یہ دیکھتا ہے ---- کہ اس عبادت میں دل کا کیا حال رہا۔ وہ اپنے معبود کی طرف متوجہ رہا یا نہیں دنیاوی خیالات سے پاک رہا یا نہیں۔ دل میں خوف الٰہی' اس کے موجود ہونے کا یقین اور صرف اسی کی محبت اور رضا و خوشنودی چاہنے کا جذبہ بھی پیدا ہوا کہ نہیں۔ اس عبادت سے روح کی پاکیزگی کہاں تک ہوئی؟ اخلاق و کردار کہاں تک درست ہوا؟ اور نفس کا

تزکیہ کہاں تک ہوا! یہ تمام باتیں جو نماز کے اصل مقصد سے تعلق رکھتی ہیں جس قدر کمال کے ساتھ حاصل ہوں گی تصوف کی نظر میں نماز اتنی ہی زیادہ کامل ہو گی۔ اور ان میں جتنا نقص رہے گا اسی لحاظ سے نماز ناقص ہو گی۔

محسن انسانیت ﷺ کے فرمان کا بھی یہی مطلب ہے جو بیان کیا گیا ہے کہ عبادت کی حقیقت اور استغراق یہ ہے کہ تو اللہ کو دیکھے اگر یہ مقام نہیں ملا تو اتنا ضرور ہو کہ دل اس بات پر کامل یقین کرے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اگر اتنا بھی نہیں تو پھر ایسی عبادت قابل قبول نہیں --- حدیث کی رو سے تصوف کی وضاحت یہی ہے۔

تصوف کی ابتداء

تصوف کی ابتداء بعثت نبوی کے ساتھ ہی ہو گئی تھی۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ ہادی برحق ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی آیات کی تلاوت، تزکیہ نفس اور کتاب و حکمت کی تعلیم دینا ہے تاکہ اخلاق حسنہ کی تکمیل ہو جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خلق عظیم کا مالک بنایا ہے۔ اظہار نبوت کے تھوڑے عرصہ بعد ہی اللہ تعالیٰ نے سورہ مزمل نازل فرمائی تو اس کی پہلی گیارہ آیتوں میں تزکیہ نفس کے لیے ہدایات دے دی گئیں۔ جنہیں اگر تصوف کا خلاصہ کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ سورہ مزمل کی پہلی گیارہ آیات کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تصوف قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اے کپڑا اوڑھنے والے! رات کو (اللہ کی بارگاہ میں) کھڑا رہا کر مگر کم۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو یا اس سے کچھ بڑھا دو۔ اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔ بے شک ہم آپؐ پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر ہے۔ اور بہت سیدھا کرنے والا ہے بات کو۔۔ بے شک دن کے اوقات میں تو آپؐ کے لیے بہت سی مصروفیات ہیں۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو۔ اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ وہ مشرق و

مغرب کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ لہٰذا اسی کو اپنا کارساز بنالو۔ اور جو باتیں لوگ (آپؐ کے بارے میں) بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو۔ اور شرافت کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ۔ اور ان جھٹلانے والے خوشحال لوگوں سے نمٹنے کا کام آپؐ مجھ پر چھوڑ دیں۔ اور انہیں تھوڑی سی مہلت دے دیں۔" (آیت ۱ تا ۱۱)

اللہ تعالیٰ نے بڑے جامع انداز میں تصوف کی بنیادی باتوں کو بیان کر دیا ہے۔ جن کی مختصر تشریح اس طرح سے ہے:

پہلی بات جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہے شب بیداری۔ راہ سلوک میں شیخ و مرشد اپنے مریدین کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ رات کے پچھلے پہر کا قیام کیا کرو۔ کہ فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ نفلی عبادت ہی سے منزل تک پہنچنے کی راہ آسان ہوتی ہے۔ اس سے ہی اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے روحانی بالیدگی اور درجات بلند ہوتے ہیں۔ تقویٰ میں استحکام اور عروج حاصل ہوتا ہے۔

دوسری بات ترتیل کے ساتھ قرآن کی تلاوت ہے۔ جس میں غورو فکر کا عنصر غالب رہتا ہے یعنی اس طرح ٹھیر ٹھیر کر قرآن پڑھنا کہ ایک ایک لفظ واضح ہو جائے۔ پھر اس کے معانی و مطالب میں غورو فکر کرنا۔ کیونکہ راہ سلوک میں کتاب کا علم حاصل کرنا بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ جب کتاب اللہ کے معانی میں غورو فکر ہو گا۔ تو اس کا اثر قلوب پر پڑے گا۔ جس سے دلوں میں گداز اور رقت پیدا ہو گی۔ دل نرم پڑ جائیں گے۔ کبھی دل اللہ کی محبت میں روئیں گے اور کبھی خشیت الٰہی سے آنسو بہہ نکلیں گے۔ نواسہ رسول حضرت حسن رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک ایسے شخص کے پاس سے ہوا جو قرآن کی ایک آیت پڑھ کر رو رہا تھا۔ حضورؐ نے یہ دیکھ کر فرمایا۔۔۔

"کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول نہیں سنا وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيلًا؟ فرمایا (اس شخص کی طرف دیکھو) یہ ہے ترتیل۔"

قرآن ایسے ہی پڑھنا چاہیے کہ اللہ کے ذکر سے ایمان والوں کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور جب ان پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو اس سے ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ مرشد کی راہنمائی میں جب سالک قرآن پر غور و فکر کرتا ہے تو وہ کتاب کے علم کا وارث بن جاتا ہے۔ اس کے لیے حجابات اٹھا لیے جاتے ہیں۔ قوت ایمانی میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے لیے ملکہ بلقیس کا تخت آنکھ جھپکتے ہی لے آنا کوئی مشکل بات نہیں رہتی۔

تیسری بات نفس امارہ کو مغلوب کرنا ہے۔ سورہ مزمل میں اس کا یہ حل دیا گیا ہے کہ نفس پر قابو پانا ہو تو تہجد کے وقت اٹھو۔ کیونکہ یہ بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ اس وقت جو بھی اٹھے گا اللہ کا مخلص بندہ بن کر اٹھے گا۔ جب دنیا سو رہی ہوتی ہے تو صرف مخلصین ہی اللہ کی بارگاہ میں کھڑے نظر آتے ہیں کبھی حالت قیام میں کبھی رکوع میں اور کبھی سجود میں اپنی عاجزی اور انکسار کا اظہار کرتے ہیں۔ خلوص کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب نفس آرام کرنے کا مطالبہ کرتا ہو اور ایمان' اٹھنے کا تقاضا کر رہا ہو۔ جب مومن اٹھ بیٹھتا ہے' نیند آرام چھوڑ کر نفس امارہ کو کچل دیتا ہے تو بارگاہ الٰہی میں کھڑے ہو کر اپنے رب کی خوشنودی حاصل کر لیتا ہے کیونکہ اس وقت بندے اور اس کے رب کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہوتا اور اس وقت زبان' دل کی پوری پوری ترجمانی کر رہی ہوتی ہے۔ اس گھڑی نہ ریا کا خوف ہوتا ہے نہ دکھاوے کا ڈر۔ ایسے ہی وہ مخلصین ہوتے ہیں جن پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا۔ قرآن میں اللہ کا یہ وعدہ صرف اپنے مخلص بندوں کے ساتھ ہی ہے۔ جب اس شب بیداری پر مداومت ہوتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندے کے لیے خوشخبری بھیجتا ہے کہ اے میرے بندے میں نے تجھے اپنے قرب میں جگہ دے دی ہے۔

.........اب یہ کان تیرے نہیں' میرے ہیں' یہ آنکھیں تیری نہیں میری ہیں' یہ ہاتھ تیرے نہیں میرے ہیں۔ یہ پاؤں تیرے نہیں میرے ہیں۔ اگر تو مجھ سے مانگے گا تو میں ضرور دوں گا۔ اور اگر میری پناہ چاہے گا تو پناہ دوں گا۔ اللہ کی طرف سے یہ نوید

کتنی خوش کن ہوتی ہے۔ اور ایسے بندے بھی کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں۔

چوتھی بات یہ کہ جب غافل لوگ سو رہے ہوتے ہیں اور اخلاص والے اپنے رب کی رضا کے حصول کے لیے بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوتے ہیں تو ایسی پرسکون گھڑی میں بندہ اپنے رب کے حضور جو بھی عرضداشت پیش کرتا ہے اللہ قبول فرماتا ہے۔ دعا کی قبولیت کی یہ گھڑی صرف مخلصین کو ہی نصیب ہوتی ہے۔

عام مسلمان کے لیے تو اللہ تعالیٰ معبود ہے لیکن مخلصین کے لیے اللہ تعالیٰ مقصود بھی ہے۔ اس لیے وہ طلوع فجر کا انتظار نہیں کرتے بلکہ بہت پہلے ہی بستر چھوڑ دیتے ہیں کہ شب بیداری ہی سے نفس مغلوب ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تزکیہ نفس کے لیے سورہ مزمل میں جامعیت کے ساتھ وہ طریقے بتا دیئے ہیں جو صوفیاء کرام حضورؐ کی سنت اور صحابہ کرامؓ کی طرز زندگی اپنا کر حاصل کرتے ہیں۔ کہ ان کا مقصود حیات اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور یہ تبدیلی راہ سلوک میں ذکر و فکر' مراقبے اور مجاہدے کے ساتھ حق تعالیٰ سے شدید محبت کی وجہ سے آتی ہے۔ یہی تصوف ہے۔ جس بندے کا مقصود اللہ تعالیٰ ہو اس کی آرزو بھی یہی ہوتی ہے۔ کہ اسے اپنے رب کے قرب تک رسائی حاصل ہو جائے۔ اس راہ میں اس کا کوئی عمل بھی منشائے الٰہی کے خلاف نہیں ہوتا۔ وہ اس لیے کہ اس کے سامنے اللہ کی آیات ہوتی ہیں جن پر وہ غورو فکر کرتا رہتا ہے۔ اور منشائے الٰہی کو پالیتا ہے۔ اس کے پاس کتاب کا علم ہوتا ہے اور اس کی روشنی میں حضورؐ کی اتباع اور سنتؐ کی پیروی میں اس کی زندگی کے سب لمحات گزرتے ہیں۔ وہ صاحب بصیرت ہوتا ہے جو کتاب اللہ کی ہر آیت سے راہنمائی حاصل کرتا ہے اسکے سامنے یہ آیت بھی ہوتی ہے۔ جس کا ترجمہ ہے:

"پس جو شخص اپنے رب سے ملاقات کا آرزو مند ہو تو اسے چاہیے کہ وہ نیک اعمال بجالائے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔"

(قرآن ۱۸:۱۱۰)

پانچویں بات وہ آہ سحرگاہی ہے کہ دل کی گہرائیوں سے بوقت تہجد جو

آواز نکلتی ہے وہ اثر رکھتی ہے۔ جو استغفار کیا جاتا ہے وہ گناہوں کو دھو ڈالتا ہے۔ بندہ اس وقت اپنے رب کی نظر کرم اور نگاہ خاص کے احاطے میں ہوتا ہے۔

چھٹی بات اللہ کا ذکر ہے کہ تو اپنے رب کے نام کا ذکر کرے۔ کہ تیرے لیے یہی اکسیر ہے سالک جب مرشد کی ہدایت اور راہنمائی میں اللہ کا ذکر کرتا ہے تو اسے قلبی طمانیت حاصل ہو جاتی ہے۔ جو اس راہ کے راہی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اگر دل مطمئن نہیں ہے تو نہ عبادت میں خلوص آسکتا ہے اور نہ روحانی ارتقاء ہو سکتا ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ کہ اپنے رب کے نام کا ذکر کرو۔" یہی ذکر اسم ذات ہے جس سے صوفیائے کی زبانیں ہر وقت تروتازہ رہتی ہیں۔ اور وہ غفلت کا شکار نہیں ہوتے۔

جو دم غافل سو دم کافر-- مرشد نے فرمایا ھو۔

ساتویں بات جو سورہ مزمل کی ان آیات میں ارشاد فرمائی گئی ہے وہ اصول تصوف میں انتہائی اہم ہے --- وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلاً۔ "اور سب سے کٹ کر صرف اسی کے ہو رہو۔" یہ رجوع الی اللہ ہے۔ کہ سب تعلقات رشتے ناطے اور محبتیں ایک طرف رکھ کر حقیقی محبت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی سے کی جائے۔ عبد اور معبود کا جو تعلق ہے وہ دنیا کے تمام تعلقات اور رشتوں پر فائق ہے۔ ہمیں دنیا چھوڑنے کا حکم نہیں ہے۔ اور نہ ہی اسلام رہبانیت کی اجازت دیتا ہے۔ یہ دنیا ہماری کھیتی ہے جس میں ہم نیکی کا بیج بوئیں گے تاکہ آخرت کی فصل بہتر سے بہتر پیداوار دے۔ ہمیں اس دنیا میں رہنا ہے۔ لیکن یہاں دل لگانے کی اجازت نہیں اور نہ ہم اس دنیا اور اس کی آسائشوں کو آخرت پر ترجیح دے سکتے ہیں۔ یہ دنیا تو سراسر ایک آزمائش گاہ ہے۔ ہر ایک کو پرکھا جا رہا ہے۔ سورہ توبہ کی آیت ۲۴ ہمیشہ صوفیا کے سامنے رہی۔ اور انہوں نے اس سے سبق حاصل کیا۔ اور اپنی زندگیاں اللہ، اس کے رسول اللہ ﷺ کی محبت اور جہد مسلسل میں گزار دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں کو بات سمجھا دی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: (اے رسولؐ) فرما دیجئے کہ اگر تمہارے باپ دادا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں۔ اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو، تمہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں تو پھر اللہ کے حکم کا انتظار کرو۔ اور اللہ تعالیٰ فاسق و فاجر قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔"

اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے ہر طرح کے بندھنوں کا ذکر فرما دیا ہے جن میں انسان اپنے آپ کو اپنی فطرت اور ضرورت کے باعث بندھا ہوا پاتا ہے۔ والدین بہن بھائیوں، بیوی بچوں اور رشتہ داروں کے ساتھ محبت و الفت سب انسانی فطرت کے تقاضے ہیں۔ اسی طرح مال و دولت، کاروبار اور مکانات وغیرہ بھی انسانی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ ان سے لگاؤ بھی فطری بات ہے کہ یہ سب کچھ عزت و وقار اور آرام و آسائش کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن دیکھا جائے تو انسانی زندگی کی غرض و غایت صرف انہی چیزوں تک محدود نہیں۔ بلکہ بہت آگے اور بہت بلند ہے۔ مومن کے لیے دنیا کے یہ سارے بندھن اس وقت ٹوٹ جاتے ہیں جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرمؐ مومن سے قربانی مانگتے ہیں۔ یہ قربانی صرف دو طرح کی ہے۔ جان اور مال۔ تو یہ قربانی صرف اس وقت ہی دی جا سکتی ہے جب تزکیہ نفس ہو چکا ہو۔ جب صوفی مقام ایثار پر پہنچتا ہے تو وہ زہد کی بھٹی سے نکل چکا ہوتا ہے۔ دنیا کی حرص و طمع اور مال و متاع کی رغبت اس کی روحانی ترقی میں حائل نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ بندھن اللہ اور اس کے محبوب کریمؐ کی محبت سے ٹکراتے ہیں۔ اللہ کے راستے میں جہاد اور خواہ مالی ہو یا جانی جب بلاوا آجاتا ہے تو پھر نہ والد کی محبت راستہ روکتی ہے اور نہ یہ بیوی بچے اور مال تجارت پاؤں کی زنجیر بنتے ہیں۔ صوفیاء کی زندگیاں چونکہ جہد مسلسل میں بسر ہوتی ہیں اس لیے وہ دنیا کی محبتوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت پر قربان کر دیتے ہیں۔ ان کے سامنے حضورؐ کا یہ فرمان بھی تو ہوتا ہے۔

"تم میں سے کوئی شخص بھی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں (محمدؐ) اس کے والد' اولاد اور سب لوگوں سے محبوب تر نہ ہو جاؤں۔" (بخاری و مسلم)

آٹھویں بات جو سورہ مزمل میں ارشاد فرمائی گئی ہے وہ ہے' اللہ تعالیٰ کی وکالت اور کارسازی۔ کہ وہ اللہ جو مشرق و مغرب کا رب ہے' کل کائنات کا مالک ہے اور خود مسبب الاسباب ہے تو کیوں نہ اسے ہی اپنا وکیل اور کارساز بنایا جائے۔ دنیاوی اسباب کے پیچھے بھاگنے کی بجائے اسباب پیدا کرنے والے پر ہی مکمل بھروسہ کرلیا جائے۔ راہ حق میں جو بھی مشکلات اور تکالیف آئیں وہ اس راہ کی رکاوٹیں نہ بن جائیں۔ ایسے اوقات میں اللہ ہی کو اپنا وکیل اور کفیل بنایا جائے۔ صوفی ہمیشہ توکل کے بلند مقام پر فائز ہوتا ہے۔

نویں بات صبر کی تلقین ہے۔ کہ ہر طاغوت کے مقابلے میں جو بھی تکلیف آئے اس سے پریشان ہو کر ایمان کو کمزور نہیں ہونے دینا بلکہ صبر و استقلال کی قوت سے ہر طاغوتی طاقت کا مقابلہ کرنا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ مخالفین کی باتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے جہاد فی سبیل اللہ پر مداومت رہنی چاہیے۔ خواہ وہ جہاد میدان جنگ میں ہو یا میدان امن میں برائی کے خلاف ہو اور خواہ نفسانی خواہشات کے خلاف ہو۔ ہر میدان میں صبرو تحمل کی چٹان بن کر کھڑے ہونا ہے۔

دسویں بات یہ بتائی گئی ہے کہ مخالفین اور جہلا سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ لڑائی جھگڑے سے نہیں بلکہ عمدگی اور خوبصورتی کے ساتھ۔ صوفیا ایسے ہی اخلاق و کردار سے متصف ہوتے ہیں۔ وہ خواہ مخواہ الجھتے نہیں۔ بلکہ خلق اور عجزو انکسار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ظالم کی زیادتی پر بھی دعا دیتے ہیں۔ اور نرمی کے ساتھ الگ ہو جاتے ہیں۔

تصوف کے یہ دس بنیادی اصول ہیں جو سورہ مزمل کی ابتدائی گیارہ آیات میں بیان کئے گئے ہیں۔ تصوف کی تعلیمات کا یہ خلاصہ سب سے پہلے قرآن ہی

نے بیان کیا ہے۔

معترضین نے اعتراض کیا کہ "تصوف" کا لفظ نہ تو قرآن میں ہے' نہ کتب حدیث میں' نہ عہد رسالتؐ میں' نہ دور صحابہؓ میں اور تابعین کے دور میں بھی اس لفظ کو استعمال نہیں کیا گیا یہ تو بعد کی پیداوار ہے لہٰذا اس کا کیا اعتبار------؟

دراصل یہ اعتراض "لفظ تصوف" پر تو ہو سکتا ہے اس کے طریق کار پر نہیں۔ یہ درست کہ یہ لفظ نہ قرآن میں ہے اور نہ کتب حدیث میں ---- لیکن یہ لفظ جس مقصد اور لائحہ عمل کے لیے بولا جاتا ہے کیا وہ لائحہ عمل قرآن و حدیث میں نہیں ہے------؟

اگر ہم صلوٰۃ کی جگہ "نماز" اور صوم کی جگہ "روزہ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو کیا نماز اور روزے کا طریقہ بدل جانا چاہیے۔ اور جس مقصد کے حصول کے لیے نماز پڑھی جاتی ہے یا روزہ رکھا جاتا ہے کیا الفاظ کی تبدیلی سے وہ مقصد ختم ہو جاتا ہے؟ اگر صرف' نحو' منطق اور قواعد وغیرہ کے الفاظ قرآن و حدیث میں موجود نہیں تو کیا آج ان کا سیکھنا ناجائز ہے؟ غور کیجئے گا------!

قرآن و حدیث میں تصوف کا لفظ نہ سہی مگر جس مقصد کے لیے "تصوف" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کیا اس مقصد کے حصول کے لیے قرآن و حدیث میں تاکید نہیں کی گئی؟ کیا وہ مقصد حاصل کرنا تکمیل دین نہیں؟

مقصد کے حصول کے لیے کسی بھی طریق کار کو کوئی بھی الفاظ یا اصطلاحی معانی پہنائے جا سکتے ہیں۔ اسے کوئی بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ سورہ مزمل کی پہلی گیارہ آیات میں تصوف کے مقاصد اور ان کا خلاصہ ہی تو بیان کیا گیا ہے۔ تصوف کا کوئی اصول ایسا نہیں جو قرآنی آیات پر مبنی نہ ہو۔ حیرت ہے ان لوگوں پر جو تصوف کے اصولوں اور لائحہ عمل کو یونان' ایران اور ہندوستان سے درآمد کرتے ہیں۔

لہٰذا لفظی تکرار تو اب ختم ہو جانا چاہیے اب ہم بات کرتے ہیں اس مقصد کی جس کے حصول کے لیے تصوف کام کرتا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے پوچھتے

ہیں---- اے باری تعالیٰ ہم تجھ پر ایمان لے آئے۔ تیرے فرشتوں' کتابوں' رسولوں کو بھی مان لیا۔ اور یوم آخرت پر بھی یقین کر لیا۔ اب تو ہمیں بتا کہ اس ایمان لانے کا مقصد کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے اس سوال کا جواب سورہ بقرہ کی آیت ۱۶۵ میں دے دیا۔ ارشاد ہوتا ہے ------ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ یعنی جو لوگ ایمان لے آئے ہیں ان کو سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے" اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے شدید محبت کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں آپ اس طرح سمجھ لیں کہ ایمان لانے کا مقصد اللہ تعالیٰ سے شدید محبت کا حصول ہے۔ یہ اس سوال کا جواب ہمیں مل گیا جو ہم نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا۔ اب ہم اپنے مرشد حقیقی نبی کریم رؤف و رحیم رسول مکرم ﷺ سے دریافت کرتے ہیں۔

یا رسول اللہ ﷺ آپ ہمیں بتائیں کہ ایمان لانے کے بعد ہمیں کیا ملنا چاہیے حضورؐ فرماتے ہیں: تین باتیں اگر تم میں ہوں گی تو تم ایمان کی حلاوت پالوگے۔ (یعنی ایمان کی مٹھاس اور مزا چکھ لوگے) ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسولؐ تمہیں سب سے زیادہ محبوب ہوں۔ دوسرے یہ کہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کسی سے دوستی ہو تیسرے یہ کہ تمہیں دوبارہ کفر میں جانا اسی قدر ناگوار ہو جیسے آگ میں خود کو جھونک دینا۔" (بخاری و مسلم)

پس رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی بات کو واضح فرمادیا کہ ایمان لانے کا مقصد حقیقی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی محبت میں کامل ہونا ہے۔ دونوں طرف سے ہمیں ایک ہی جواب ملا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محبت ہوتی کیا ہے؟ اور یہ کہاں سے اٹھتی ہے؟ ----- محبت قلبی میلان اور دل کی چاہت کا نام ہے۔ یہ قلب کے اندر سے اٹھتی ہے۔ پروان چڑھتی ہے اور اس میں شدت پیدا ہوتی ہے۔ پس اس کا مقام قلب مومن ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ جہاں اللہ کی محبت پیدا ہوتی ہے اس کا تزکیہ ہو جائے کیونکہ اگر دل پاکیزہ اور صاف ستھرا نہ ہوگا تو وہاں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی

محبت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اب اللہ کی محبت پیدا کرنا' اسے پروان چڑھانا بلکہ اس میں عشق کی حد تک شدت پیدا کرنا ہی ایمان کا تقاضا ہے۔ اور یہی وہ مقصد ہے جس کو ہم نے حاصل کرنا ہے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تصوف کی ضرورت ہے۔ اصل میں تصوف ہمارا مقصود نہیں۔ ہمارا مقصود تو اللہ رب العزت ہے۔ اس کی رضا اور محبت ہے۔ اور یہ محبت کوئی سطحی سی محبت نہیں ہوتی اور نہ زبانی دعوے کے طور پر کی جاتی ہے بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے وہ اپنے تقاضے پورے کرتی ہے۔ اس محبت کا سب سے بڑا تقاضا کیا ہے؟ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسولؐ جس کام کے کرنے کا حکم دیں اسے مقدور بھر کیا جائے اور جس کام سے روک دیا جائے۔ اس سے فوراً رک جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور حضورؐ کی اتباع میں سر تسلیم خم کر دیا جائے۔ جب اس محبت میں ہم نماز پڑھیں گے تو وہ نماز بوجھ نہیں بنے گی۔ روزہ رکھیں گے تو بھوک پیاس تنگ نہیں کرے گی۔ زکوٰۃ دیں گے تو دل میں مال کی کمی کا ڈر نہیں رہے گا۔ حج صرف رضائے الٰہی کے لیے کریں گے حاجی کہلانے کے لیے نہیں۔ ہر نیکی کا کام کرنے سے قلبی راحت نصیب ہو گی اور ہر گناہ سے دلی نفرت ہو جائے گی۔ یہی تقویٰ ہے۔ ایسا کب ہوتا ہے؟ ---- جب قلب کی تطہیر ہو چکی ہوتی ہے اور تزکیہ نفس ہو چکا ہوتا ہے۔ پھر قلب میں کشادگی آجاتی ہے اور طبیعت میں حلیمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ایسا مومن حسن خلق کا پیکر بن جاتا ہے۔ وہ اللہ کے ہاں پسندیدہ اور معاشرے کے اندر گرویدہ بن جاتا ہے۔ تصوف یہی کام کرتا ہے۔ اگر کوئی ایسے تصوف کو تسلیم نہیں کرتا یا اسے کوئی اور معانی پہناتا ہے تو یہ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔ یہاں مجھے سورہ الزمر کی آیت ۲۲ یاد آ رہی ہے۔

"اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ"

"اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک نور پر چل رہا ہے (اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے اللہ

کی نصیحت سے ہدایت حاصل نہ کی) پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جن کے قلوب اللہ کی نصیحت سے اور زیادہ سخت ہو گئے۔ وہ تو کھلی گمراہی میں جا پڑے۔"

جب تزکیہ نفس کے بعد قلب کی تطہیر ہو جاتی ہے اور یہ محبت دل کے اندر سما جاتی ہے تو پھر مومن کو ایک دھڑکا سا لگ جاتا ہے۔ اسی محبت کے اندر ایک خوف سا چھا جاتا ہے۔ اور اس کا چھا جانا ہی شدید محبت کی علامت ہے۔ اسی کو خوف الٰہی کہتے ہیں۔ جو دانائی کی بنیاد ہے۔

یعنی اللہ کا ڈر۔ اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ڈر اور خوف اس کی ذات سے نہیں ہوتا۔ یہ خوف اللہ کی ناراضی کا خوف ہوتا ہے۔

اس کی ذات سے تو مومن شدید محبت کرتا ہے۔

اور محبت نام ہی اس خوف کا ہے جو ہر وقت دھڑکا لگائے رکھے مبادا کوئی ایسا کام یا غلطی سرزد ہو جائے جس سے اللہ ناراض ہو جائے۔ اصول بھی یہی ہے کہ جس سے بھی کسی انسان کی سچی محبت ہوتی ہے وہ اپنے محبوب کی ناراضی سے ڈرا رہتا ہے۔ اور ہر لحہ اس کی رضا کے حصول کے لیے سرگرداں رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ زمر میں مومن کی اس کیفیت کو بیان فرمایا ہے۔

"اللہ نے بہترین کلام نازل کیا۔ ایک ایسی کتاب (کی صورت میں) جس کے تمام اجزا باہم ملتے جلتے ہیں۔ اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں۔ اسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب (کی ناراضی) سے ڈرنے والے ہیں اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ (قرآن آیت: ۲۳)

حضورؐ نے اپنے ایک فرمان میں ایمان کامل کے لیے حب الٰہی اور رضائے الٰہی کو شرط قرار دیا ہے ارشاد ہوتا ہے: "(جس شخص کا یہ حال ہو کہ) وہ اللہ ہی کے لیے محبت کرے اور اللہ ہی کے لیے بغض رکھے اور اللہ ہی کے لیے (اس کی راہ میں) دے اور اسی (کی رضا) کے لیے ہاتھ کو روک لے تو اس نے اپنا ایمان کامل

کرلیا۔" (مشکوۃ شریف)

پس اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنا ہی ایمان کا مقصد اور اس کا تقاضا ہے۔ محبت کا مرکز مومن کا قلب ہے۔ اور یہی اللہ کے سما جانے کی جگہ۔ ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے اس راز سے پردہ اٹھایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"میں نہ تو زمین میں سما سکتا ہوں اور نہ آسمان میں۔ اگر سما سکتا ہوں تو بندہ مومن کے قلب میں"

تو اس قلب کا تزکیہ ہر وقت ہوتا رہنا چاہیے نا! تاکہ مقصد پورا ہوتا رہے۔ اور یہ کام تصوف کرتا ہے۔ اس قلب کے لیے حضور رسالت مآب ﷺ نے خود اللہ تعالیٰ سے بہت سی دعائیں کی ہیں۔ تاکہ ایسی ہی دعائیں ہم بھی مانگیں اور اصلاح قلب کے لیے کوشاں رہیں۔

مثلاً حضور ﷺ نے ایک مرتبہ دعا مانگی

"اللهم افتح مسامع قلبی لذکرک"

"اے اللہ! میرے دل کے کان اپنے ذکر کے لیے کھول دے۔"

ایک موقع پر دعا فرمائی۔

"اللهم انی اسالک قلوبا اواهة مخبتة منیبة فی سبیلک"

"اے اللہ میں تجھ سے ایسے قلوب کا سوال کرتا ہوں۔ جو نرم اور درد آشنا ہوں شکستہ اور تیری طرف رجوع کرنے والے ہوں۔"

حب الٰہی کے لیے دعا مانگی

"اللهم اجعل حبک احب الی من نفسی و اهلی و من الماء البارد"

"اے اللہ! مجھے ایسا بنا دے کہ تیری محبت مجھے اپنی ذات سے اور اپنے اہل و عیال سے اور (سخت پیاس کے وقت) ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب ہو۔"

خشیت اور یاد الٰہی کے لیے دعا فرمائی

"اللھم اجعل وساوس قلبی خشیتک و ذکرک واجعل ھمتی وھوای فیما تحب و ترضی"

"اے اللہ میرے دل میں وسوسے اور خیالات بھی بس تیری خشیت اور تیری یاد ہی کے آئیں۔ اور میری تمام تر توجہ اور چاہت ان چیزوں کی طرف ہو جو تجھے محبوب ہوں۔ اور جن سے تو راضی ہو۔"

نور قلب کے لیے حضورؐ نے لمبی دعا فرمائی۔

"اللھم اجعل لی فی قلبی نورا و فی سمعی نورا وفی بصری نورا و عن یمینی نورا وعن شمال نورا و فوقی نورا و تحتی نورا واجعل لی نورا۔"

" اے اللہ تو کر دے میرے دل میں نور اور میرے کانوں میں نور اور میری آنکھوں میں نور اور میرے دائیں نور اور میرے بائیں نور اور میرے اوپر نور اور میرے نیچے نور اور مجھے سراپائے نور کر دے۔" (بخاری و مسلم)

ان دعاؤں کے بارے میں غور کیا جائے تو ان سب میں مختلف قلبی کیفیات کا ذکر ہے۔ اور ان سے اصلاح قلب کا پہلو نکلتا ہے۔ حضورؐ نے بڑی توجہ' انہماک اور فکر کے ساتھ قلوب کے بارے میں دعائیں مانگی ہیں۔ وہ اس لیے کہ یہی قلب ہے جو بگڑ جائے تو سارے وجود حیوانی کے افعال و اعمال بگڑ جاتے ہیں۔ اور یہی قلب ہے جو سنور جائے تو انسان کی سیرت و کردار سنور جاتے ہیں۔ انسانی قلب --- افکار و خیالات' جذبات و احساسات اور تمام حرکات و سکنات کا مرکز و محور ہے۔ پہلے قلب میں ارادہ پیدا ہوتا ہے پھر انسان اس ارادے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس لیے اعمال کا دارومدار نیت قلب پر ہے۔ لہٰذا قلب کی اصلاح انسانی اعضاء کی درستی سے زیادہ مقدم ہے۔ کیونکہ بدن' انسانی قلب کے تابع ہے۔ قلب کی اصلاح ہو گئی تو اعمال خود بخود صحیح اور صالح ہو جائیں گے۔ اس قلب کا براہ راست تعلق انسانی ذہن کے ساتھ ہے۔ جہاں اچھائی یا برائی کے بارے میں انسان فیصلہ کرتا ہے۔ اور

عقل و شعور کے ذریعے اس بات کا ادراک رکھتا ہے کہ جو کام بھی وہ کرنا چاہتا ہے وہ کس نوعیت کا ہے۔ جب ایک کام کے کرنے کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو قلب اس پر عمل درآمد کراتا ہے اس عملدر آمد پر ہی جزا اور سزا ہے اس حرکت کو عمل کا نام دیا جاتا ہے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم ذہنی طور پر کسی کام کو اچھا سمجھتے ہیں۔ لیکن اچھا سمجھنے کے باوجود اس پر عمل نہیں کرتے۔ مثلاً جب پوچھا جاتا ہے کہ آپ نماز پڑھنے کو ایک عمل خیر سمجھتے ہیں مگر پڑھتے کیوں نہیں؟ تو جواب ملتا ہے--- "دل نہیں کرتا"

پتہ یہ چلا کہ ذہن اور عقل و شعور نے یہ فیصلہ دے دیا کہ نماز پڑھنا اچھا کام ہے۔ اب اس پر عمل درآمد کرانا قلب کا کام ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ قلب ہی پر اعمال موقوف ہیں۔ یہ قلب مقام روح ہے۔ جو گوشت پوست کے بنے ہوئے دل کے اندر ہے۔ مرشد حقیقی حضور ہادی برحق ﷺ نے جو فرمایا کہ ---- خبردار تمہارے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب یہ صحیح ہوا تو سارا جسم درست رہے گا۔ اور اگر یہ بگڑ گیا تو سارا جسم بگڑ جائے گا۔ یاد رکھو کہ یہ قلب ہے۔"

یہاں حضورؐ نے "فواد" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ حالانکہ گوشت پوست سے بنا ہوا دل "فواد" کہلاتا ہے۔ دراصل حضورؐ نے بات ذہن نشین کروانے کے لیے دل کی ظاہری صورت کی نشاندہی فرمائی کہ گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جو دھڑک رہا ہے۔ لیکن جب اس کی خصوصیات کو بیان فرمایا تو دل کی باطنی صورت یعنی "قلب" کا نام لیا۔ یہی قلب ہے جو وجود روحانی رکھتا ہے اور یہی روح کا مسکن ہے۔ لہٰذا اس کا تزکیہ انتہائی ضروری ہے ورنہ اعمال کی درستگی کی امید رکھنا عبث ہے۔

نبی کریم ﷺ امت کے حکیم ہیں۔ قرآن نسخہ کیمیاء ہے۔ حکیم نے اس نسخہ کیمیا کے ذریعے امت کے مریضوں کا علاج کیا ان کے قلوب اور نفوس سے امراض کی آلائشوں کو دور کر کے ان کا تزکیہ کیا۔ انہیں صاف ستھرا کیا۔ اور ان کے سینوں کو حکمت و دانائی سے بھر دیا۔ اصل کام تزکیہ نفس ہے۔ جس کی ابتداء نبی

رحمت ﷺ نے فرمائی- اور یہ آپؐ کے فرائض نبوت میں سے ایک فرض تھا کیونکہ جب تک تزکیہ نفس نہ ہو فلاح وکامیابی ناممکن ہے- اور یہی تصوف کی بنیادی چیز ہے- ارشاد ہوتا ہے-

"قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى"

"بے شک اس نے فلاح پائی جس نے تزکیہ (نفس) کیا-" (قرآن ۸۷ : ۱۴)

اب اس تزکیہ نفس کی جزاء کیا ہے؟ اگر اس کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے- کہ اس کی کیا اہمیت ہے- اور نجات دائمی کے لیے اس کی کس قدر ضرورت ہے- سورۃ طٰہٰ کی اس آیت پر غور کیجئے-

"وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ○ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى"

"اور جو اسکے حضور ایمان کے ساتھ آئے- (اس حالت میں) کہ اچھے کام کئے ہوں- تو انہی کے درجے اونچے ہیں سدا بہار باغ جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں- ہمیشہ ان میں رہیں گے- اور یہ اسکا بدلہ ہے- جس نے تزکیہ نفس کیا-" (قرآن ۲۰:۷۶)

نفس کی اصلاح کی اشد ضرورت کے تحت اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی کی دونوں راہوں سے انسان کو اگاہ کر دیا ہے- اب کامیابی اسی کی ہے جس نے نفس امارہ کو نفس مطمنہ میں تبدیل کر لیا-

"فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا ○ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○ "

"(ہر نفس کو) اس کی بدی اور نیکی سے آگاہ کر دیا گیا ہے- بے شک وہی مراد کو پہنچا جس نے اس (نفس) کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو گناہ (کی دلدل) میں چھپا دیا-" (قرآن ۹۱ : ۸ - ۱۰)

نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ کے قلوب کا تزکیہ کیا- ان کے نفوس کو صاف

ستھرا کیا۔ تو یہ سلسلہ رکا نہیں بلکہ مسلسل آگے بڑھتا گیا۔ صحابہؓ نے تابعینؒ کا تزکیہ فرمایا۔ پھر انہوں نے تبع تابعینؒ کا پھر اسی طرح صوفیاء عظام اس سلسلے کو لے کر آگے بڑھتے گئے۔ اور فریضہ اولیائے امت نے سرانجام دیا۔ حضور نور مجسمؐ تو ایک روشن چراغ تھے۔ جن سے ان گنت چراغ روشن ہوئے اور انہوں نے قلوب کے اندھیروں کو دور کرکے ذکر اللہ کی شمعیں روشن کیں۔

"یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۝ وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝ "

"اے نبیؐ! بیشک ہم نے آپؐ کو شاہد' بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا۔ اور اللہ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا۔ اور روشن چراغ۔" (قرآن ۳۳: ۴۵' ۴۶)

یہی ہے وہ راہ سلوک' وہ مسلک وہ تصوف جو عہد نبویؐ اور دور صحابہؓ و تابعینؒ میں تھا۔ قرآن نے اسی کو تزکیہ اور حکمت کہا۔ حضورؐ نے کتاب و حکمت کی تعلیم دی کہ آپؐ معلم انسانیت تھے۔

تصوف کیا ہے---- یہی معلم اور متعلم کا تعلق۔ یہی کتاب و حکمت کی تعلیم اور تزکیہ نفوس۔ حضورؐ کے فرائض کو بعد میں اولیائے امت نے سرانجام دیا۔ علم و حکمت کی تدریس کے مراکز قائم کئے۔ نظم و ضبط کے تحت ایک سلسلے کو قائم کرکے مریضوں کے امراض کے مطابق تشخیص کی اور قلوب کا تزکیہ کیا۔ قرآن نے اس کی گواہی دی۔

"وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ "

"اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے۔ جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے۔ اور نیکی کا حکم دے۔ اور برائی۔ سے منع کرے۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

(قرآن ۳: ۱۰۴)

یہی اولیائے امت کی مقدس جماعت ہے جو ہر دور میں نیکی کا حکم دیتی

رہی اور برائی سے بے خوف و خطر روکتی رہی۔ اپنا تزکیہ نفس کیا۔ اور دوسروں کو صاف ستھرا کیا۔ یہی فلاح پانے والی جماعت ہے جو خیر کی طرف بلاتی ہے۔

تصوف کیا ہے۔؟

بقول سید محمد ذوقی۔

تصوف کلیۃً اسلام ہے۔ اسلام کی روح ہے۔ اسلام کا حسن و جمال ہے۔ اور اسلام کا کمال ہے۔

تصوف

☆ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ کی تصدیق ہے (سورہ الزمر)
"یاد رکھو دین خالص اللہ ہی کے لیے ہے"

☆ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ کی تفسیر ہے (سورہ فالانشقاق)
"تو اپنے رب کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔"

☆ وَ تَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا کی تعمیل ہے۔ (سورہ المزمل)
"اور سب کو چھوڑ کر اسی (رب) کے ہو رہو۔"

صوفی ہمیشہ

☆ اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَھٰھَا۔ کو پیش نظر رکھتا ہے۔ (سورہ النزعات)
"آپؐ کے رب تک ہی اس کی انتہا ہے"

☆ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا۔ سے حوصلہ افزائی پاتا ہے۔ (سورہ الشمس)
"وہ تو فلاح پا گیا جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔"

☆ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا۔ سے عبرت پکڑتا ہے۔ (سورہ الشمس)
"اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے (گناہ تلے) چھپا دیا۔"

☆ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَ نَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی ○ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی ○ سے متاثر ہو کر ہوائے نفس کی گردن پر مجاہدے کی چھری پھیرتا ہے۔ (سورہ النزعت)

"اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا۔ جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی۔"

☆ يَاۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِيۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ○ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ○ کی بشارت سے از خود رفتہ ہو کر آگے بڑھتا ہے۔ (سورہ الفجر)

"اے نفس مطمئن! چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو (اپنے انجام نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔"

☆ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ کے آب حیات میں غوطہ لگاتا ہے۔ (سورہ الانعام)

"بیشک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔"

☆ صِبْغَةَ اللّٰهِ کے رنگ میں رنگین ہوتا ہے۔ (سورہ البقرۃ)

"اللہ کا رنگ"

☆ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ کے حصار میں محفوظ اور متمکن ہو کر تاج مقبولیت سے سربلندی پاتا ہے۔ (سورہ البقرۃ)

"(اولیاء اللہ کو) نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

تصوف تو درحقیقت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی سچی محبت بلکہ عشق کا نام ہے۔ اور عشق کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے احکامات اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت و اتباع سے بال برابر بھی انحراف نہ کیا جائے۔

پس تصوف -- شریعت سے الگ کوئی دوسری چیز نہیں بلکہ شریعت کے احکامات کو انتہائی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ بجا لانے اور اطاعت میں اللہ کی محبت اور اس کے خوف کی روح بھر دینے کا نام ہے۔

تصوف کی تعریف

ہر دور میں صوفیا کرام نے تصوف کی بے شمار تعریفیں کی ہیں۔ اور اپنے اپنے ذوق و وجدان کے مطابق اس کی توضیح فرمائی ہے۔ ان تمام تعریفوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ تصوف درحقیقت شریعت کے تمام پہلوؤں کا بیان ہے۔ چند ایک ملاحظہ ہوں۔ حوالہ جات ....

"تذکرۃ اولیاء مصنفہ شیخ فرید الدین عطارؒ ۔ کشف المحجوب از حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ عوارف المعارف از شیخ شہاب الدین سہروردیؒ فتوح الغیب از شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تاریخ تصوف از عبدالصمد صارم لازھری۔"

۱۔ حضرت معروف کرخیؒ (۲۰۰ھ) حقیقت کی معرفت حاصل کرنا۔ دقائق پر گفتگو کرنا اور مخلوق کے پاس جو کچھ ہے اس سے نا امید ہو کر اللہ تعالیٰ سے امید رکھنا تصوف ہے۔

۲۔ حضرت ذوالنون مصریؒ (۲۴۵ھ) تمام کائنات میں صرف اللہ تعالیٰ کو پسند کرنا۔ اور اس کے احکامات کے مطابق مستقل رہنا۔

۳۔ حضرت خواجہ سری سقطیؒ (۲۵۷ھ) تصوف معرفت الٰہی کا نام ہے۔

۴۔ حضرت بایزید بسطامیؒ (۲۶۱ھ) اپنے اوپر آسائش کا دروازہ بند کرنا اور مجاہدہ اختیار کرنا۔ (یہاں آسائش سے مراد دنیاوی عیش و عشرت ہے جس میں پڑ کر انسان اللہ کو بھول جاتا ہے۔)

۵۔ حضرت ابو حفص حدادؒ (۲۶۵ھ) تصوف مکمل ادب ہے جو ادب کو ضائع کرے وہ قرب الٰہی اور قبولیت سے دور جا پڑتا ہے۔ اور مردود ہو جاتا

ہے۔

- حضرت جنید بغدادیؒ (۲۹۷ھ) — تصوف مستقل مجاہدہ نفس کا نام ہے۔
- خواجہ دینوریؒ (۲۹۹ھ) — اسرار کی صفائی۔ اسرار شریعت میں مغالطہ نہ رکھنا۔ راضی بر رضا رہنا۔ اور لوگوں سے محبت کرنا تصوف ہے۔
- شیخ ابو الحسن نوریؒ (۲۸۶ھ) — تصوف نہ رسوم میں ہے اور نہ فقط علوم میں ہے۔ بلکہ یہ سراسر اخلاق ہے۔ رسم ہوتا تو صرف مجاہدہ سے حاصل ہو جاتا ہے۔ علم ہوتا تو فقط تعلیم سے حاصل ہو جاتا۔
- حضرت خواجہ محمد ادھمؒ (۳۰۳ھ) — افعال پر ثابت قدم رہنا اور نفس کا اللہ کے ساتھ اس کی مرضی پر چھوڑ دینا۔
- حضرت احمد بن یحییٰ ابن الجلاؒ (۳۰۶ھ) — تصوف ایک حقیقت ہے۔ اور اس میں کوئی رسم نہیں۔ رسم انسان کے لیے ہے اور حقیقت حق تعالیٰ کے لیے۔ دنیا سے منہ پھیر لینا تصوف ہے۔
- حضرت خواجہ ابوبکر شبلیؒ (۳۳۴ھ) — تصوف یہ ہے کہ سب کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کا ہو رہنا۔ غیر کے تصور سے بھی دل کو صاف رکھنا۔ بلکہ یوں سمجھنا کہ غیر کا کوئی وجود ہی نہیں۔
- خواجہ ابو محمد مرتعشؒ (۳۳۸ھ) — تصوف حسن خلق اور رجوع الی اللہ

ہے۔

۱۳۔ خواجہ ابو عمر تخیل (۳۶۶ھ) اوامر و نواہی پر صبر کرنا تصوف ہے۔

۱۴۔ خواجہ ابو العباس نہاوندی (۳۷۰ھ) اپنے حال کو پوشیدہ رکھنا۔ اور ایثار و احسان کا نام تصوف ہے۔

۱۵۔ حضرت ابو الحسن حصری (۳۹۱ھ) دل کو حق کی مخالفت سے بچانا۔ اور تزکیہ نفس کرنا تصوف ہے۔

۱۶۔ حضرت علی بن عثمان ہجویری (۴۶۵ھ) اپنے اخلاق اور معاملات کو صاف رکھنا۔ ہر پہلو پر صفت صفا کو لازم رکھنا۔ تصوف ہے۔ اور صوفی قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى کا مظہر ہوتا ہے۔

۱۷۔ عبدالکریم بن ہوازن قشیری (۴۶۵ھ) کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی پابندی کرنا تصوف ہے۔

۱۸۔ حضرت امام غزالی (۵۰۵ھ) تصوف علم و عمل کے مجموعے کا نام ہے۔ علم کے ذریعے نفسانی خواہشات سے کنارہ کشی کرنا۔ تزکیہ نفس کرنا۔ قلب کو غیر اللہ سے خالی کرکے ذکر الٰہی سے آراستہ کرنا۔

۱۹۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (۵۶۱ھ) تصوف کی بنیاد آٹھ چیزوں پر ہے۔

۱۔ سخاوت ابراہیم ۲۔ رضائے اسماعیل ۳۔ صبر ایوب

۴۔ مناجات زکریا ۵۔ غربت یحیٰی ۶۔ خرقہ پوشی موسیٰ

۷۔ سیاحت و تجرد عیسیٰ اور ۸۔ فقر محمد مصطفٰے ﷺ

۲۰۔ حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردی (۶۳۲ھ) تصوف قولاً، فعلاً اور حالاً اتباع رسول کا نام ہے۔

تصوف کی یہ تمام تعریفیں ہر لحاظ سے شریعت محمدیؐ کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس لیے یہ بات عین حقیقت ہے کہ تصوف شریعت ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ شریعت سے ہٹ کر کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔

المختصر اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرنا۔ ظاہری اور باطنی لحاظ سے سنت رسولؐ پر کاربند رہنا۔ تزکیہ نفس کرنا۔ خدمت خلق کرنا اور اخلاق حسنہ کے ساتھ بندگان خدا کی ظاہری اور باطنی ترقی کی طرف راہنمائی کرنا تصوف کہلاتا ہے۔"

لفظ "صوفی" کی وجہ تسمیہ

صوفی عربی زبان کا لفظ ہے۔ عربی دنیا کی قدیم ترین زبان ہے۔ اور یہ سب سے پہلی زبان ہے۔ مورخین نے اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ کہ عربی جو تمام زبانوں کی ماں ہے' ہزاروں برس تک تدوین قواعد لغت کے بغیر ہی نوع انسانی کے کام آتی رہی۔ اور ابو الاسود متوفی ۶۹ھ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے عربی زبان کے قواعد مرتب کیے۔ مسلم اور غیر مسلم محققین نے اس بات کو بھی تسلیم کیا ہے کہ عربی نہایت وسیع زبان ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ "عربی زبان میں ایسی وسعت ہے کہ اس کا احاطہ نبی کے سوا کسی سے ممکن نہیں۔"

اب اگر کوئی لفظ عربی زبان میں رائج ہو یا عربی زبان کا ہم شکل ہو لیکن قواعد کی زبان پر پورا نہ اترتا ہو تو بغیر کسی قطعی ثبوت کے اس کو عربی زبان سے خارج نہیں سمجھا جا سکتا۔ تاریخ مکہ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ لفظ صوفی عرب میں اسلام سے پہلے بھی رائج تھا۔ خواجہ ابو النصر سراجؒ نے اپنی کتاب اللمع میں لکھا ہے۔ کہ اسلام سے قبل ایک صوفی مکہ میں طواف کعبہ کے لیے آیا کرتا تھا۔

ویسے اس کا رواج حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں ہو چکا تھا۔ اور آپؓ نے اپنے ایک شعر میں اس لفظ کو استعمال کیا یہ شعر آپ نے اپنے ایک عامل کو ایک خط میں لکھ کر بھیجا تھا۔

قد کنت تشبه صوفیا له کتب
من الفرائض او آیات فرقان

"حالانکہ تو ایسے صوفی سے مشابہت رکھتا تھا۔ جو فرائض اور احکام دین کی کتابوں کا مالک تھا۔" (مصارع العشاق)

حضرت امیر معاویہؓ کا دور حکومت (۴۱ھ تا ۶۰ھ) تک تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ لفظ صوفی ۶۰ھ تک رائج ہو چکا تھا۔ اور صوفی سے مراد صالح اور پرہیزگار انسان ہے۔ جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے-- اس کے بعد حضرت حسن بصریؒ (۱۱۰ھ) اور حضرت سفیان ثوریؒ (۱۶۱ھ) کے عہد میں بھی اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ اور سب سے پہلے صوفی حضرت ابو ہاشم کوفی (متوفی ۱۶۱ھ) تھے ---- جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوئے۔

امام قشیریؒ اور حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ کی تحقیق کے مطابق

"ابو ہاشم صوفیؒ سے پہلے بھی بہت سے بزرگان دین تھے۔ جو زہد، ورع، توکل، محبت اور دوسرے معاملات دین میں ایک خاص مقام حاصل کر چکے تھے۔ لیکن پہلے شخص جو "صوفی" کے لقب سے مشہور ہوئے وہ وہی تھے۔ ان سے قبل اور کوئی شخص اس نام سے یاد نہیں کیا گیا۔ (رسالہ قشیریہ و نفحات الانس)

یورپین مستشرقین کا خیال ہے کہ تصوف کا منبع "نو افلاطونیت" ہے۔ اور تصوف پر یونانی فلسفہ کی چھاپ ہے۔ حالانکہ صوفی کا لفظ عربی ہے اور اس کو کسی یونانی زبان سے مشتق سمجھنا اور صوفیانہ خیالات کو یونانی تہذیب سے ماخوذ سمجھنا غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یونانی فلسفی افلاطون کے افکار و خیالات پر جو یونانی کتابیں موجود تھیں وہ عہد عباسیہ میں یہاں آئیں۔ اور ان کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ اور ان کتابوں میں بھی کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جو تصوف سے متعلق ہو۔ تصوف کے مسائل اس سے بہت قبل رواج پا چکے تھے۔

لفظ "صوفی" کے بارے میں بہت سی آراء کتب تصوف میں ملتی ہیں۔

جن کی مختصر تشریح درج ذیل ہے۔

ا۔ علامہ لطفی جمعہ اپنی کتاب "تاریخ فلاسفہ اسلام" میں لکھتے ہیں

صوفی کا لفظ "ثیو صوفیا" سے مشتق ہے۔ جو ایک یونانی کلمہ ہے جس کے معنی حکمت الٰہیہ کے ہیں۔ صوفی وہ حکیم ہے جو حکمت الٰہیہ کا طالب ہوتا ہے صوفیا کرام نے اس علم کا اظہار اس وقت تک نہیں کیا اور نہ خود کو اس صفت سے متصف کیا جب تک یونان کی کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں نہیں ہوا۔ اور فلسفہ کا لفظ اس زبان میں داخل نہیں ہوا۔" (قرآن اور تصوف)

علامہ لطفی جمعہ کی یہ تحقیق حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ یونانی تہذیب پر مشتمل کتب کا عربی میں ترجمہ بہت بعد میں ہوا ہے۔ اور تصوف کی ابتداء خود نبی کریم ﷺ نے کر دی تھی۔ اور لفظ صوفی حضرت امیر معاویہ کے دور حکومت (۴۱ھ تا ۶۰ھ) میں رائج ہو چکا تھا۔ اسلامی تصوف کی بنیاد یونانی فلسفہ پر نہیں بلکہ اسلام پر ہے۔ تصوف میں جتنے اہم مسائل افکار اور خیالات ہیں ان سب کا تعلق خود اسلام سے ہے۔ اور سب کا ماخذ قرآن مجید اور حدیث نبوی ہے۔ اور سب کا عملی وجود حضور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے عہد مبارک میں پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں اس پر بحث ہو چکی ہے۔

۲ - ابو ریحان البیرونی (متوفی ۴۴۰ھ) اپنی تصنیف "کتاب الہند" میں لکھتا ہے

"تصوف کا لفظ اصل میں "سین" سے تھا۔ اور اس کا مادہ "سوف" تھا جس کے معانی یونانی زبان میں "حکمت" کے ہیں۔ دوسری صدی ہجری میں جب یونانی کتب کا ترجمہ عربی میں ہوا تو یہ لفظ عربی زبان میں آیا۔ چونکہ حضرات صوفیا میں اشراقی حکماء کا انداز پایا جاتا تھا۔ اس لیے لوگوں نے ان کو سوفی یعنی "حکیم" کہنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ سوفی سے صوفی ہو گیا۔"

("اسلامی تصوف اور اقبال" از ڈاکٹر ابو سعید نور الدین)

البیرونی کا یہ بیان بھی حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ صوفیاء کرام میں

اشراقی حکماء کا کوئی انداز نہیں پایا جاتا۔ ان کا انداز عین اسلامی ہے۔

۳۔ حضرت ابو الحسن علی بن عثمان ہجویری (متوفی ۴۶۵ھ) اپنی شہرہ آفاق تصنیف کشف المحجوب میں یوں رقمطراز ہیں۔

"لوگوں نے اس اسم کی تحقیق میں بہت سے اقوال بیان کئے ہیں۔ اور کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اہل تصوف کو "صوفی" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ "صوف" کا لباس پہنتے ہیں۔ اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ صوفی کو صوفی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ برگزیدگی میں صف اول میں ہوتا ہے۔ مشائخ میں سے کسی نے کہا۔

من صفاه الحب فهو صاف و من صفاه الحبيب فهو صوفي۔

"جو محبت کے ساتھ مصفا ہو وہ صافی ہے اور جو اپنے حبیب میں محو و مستغرق اور غیر حبیب سے بری ہو وہ صوفی ہے۔"

صفا دوستان حق کی صفت ہے۔ اس لیے صوفی صفا سے مشتق ہے۔

اِنَّ الصَّفَا صِفَةُ الصِّدِّيقِ

اِنْ اَرَدَتْ صُوْفِيًّا عَلَى التَّحْقِيق

"اگر تو کامل صوفی دیکھنا چاہتا ہے تو ابوبکر صدیقؓ کو دیکھ کہ صفا ان کی صفت تھی۔" صفا مسلمہ طور پر قابل قدر ہے۔ اور اس کی ضد "کدر" ہے۔ اشیا کے لطیف حصے کا نام "صفا" اور کثیف کو "کدر" کہتے ہیں۔ چونکہ اہل تصوف اپنے اخلاق اور معاملات کو صاف رکھتے ہیں۔ اور قلبی آفات سے بری ہوتے ہیں اس لیے صوفی کہلاتے ہیں۔"

حضرت علی بن عثمان ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے صوفی کی جو وجہ تسمیہ بیان کی ہے۔ یہ ان وجوہات میں سے ایک ہے۔ جو حقیقت کے بہت قریب ہیں۔ واقعی صفا کی صفت جب تک کسی میں نہ ہو قلب کی صفائی اور تزکیہ ممکن نہیں۔ ہر قسم کی کدورتوں سے دل کو صاف کرنا اور نفوس کی آلائشوں کو دور کرنا ہی صوفی کی سیرت ہے۔ اور یہی تزکیہ نفس ہے۔ قلب کی صفائی کے بعد ہی اس میں حکمت بھری جا سکتی

ہے۔ لہٰذا لفظ صوفی کا صفا سے مشتق ہونا حقیقت کے قریب ہے۔ اگرچہ قواعد کے لحاظ سے صفا سے جو لفظ مشتق ہو گا وہ صوفی نہیں بلکہ "صفوی" ہو گا۔

حضرت علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے۔ کہ -----

"لفظ صوفی کسی اور لفظ سے مشتق نہیں کیونکہ تصوف کا مقام اس تکلف سے بالاتر ہے اشتقاق کے لیے جنس کی ضرورت نہیں۔ موجودات کی ہر چیز کثیف ہے۔ اور صفا کی ضد ہے کوئی چیز اپنی ضد سے مشتق نہیں ہو سکتی۔ صوفیا کرام کے لیے تصوف کے معنی سورج سے زیادہ روشن ہیں۔ اور کسی عبارت یا اشارت کا محتاج نہیں۔"

۴ - ابو نصر عبداللہ علی السراج الطوسی (متوفی ۳۷۸ھ) لکھتے ہیں۔

"لفظ صوفی کی نسبت لباس "صوف" سے ہے کہ انبیاء' اولیاء اور اصفیاء کا لباس تھا۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری کہلاتے تھے۔ جس کے معنی سفید لباس والوں کے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں اگرچہ یہ لفظ نہیں ملتا تو اس کا سبب یہ ہے کہ "صحابی" سے بڑھ کر اور کوئی معزز لفظ نہ تھا۔ یہ غلط ہے کہ اہل بغداد نے یہ لفظ اختیار کیا۔ حضرت حسن بصریؒ اور سفیان ثوریؒ کے عہد میں بھی یہ لفظ رائج تھا۔ اور "تاریخ مکہ" میں محمد بن اسحاق اور دوسروں کی سند پر روایت کی گئی ہے کہ یہ لفظ عہد اسلام سے پہلے بھی رائج تھا۔" (کتاب اللمع)

جہاں تک صوفی کے لفظ کا تعلق "صوف" یعنی لباس پشمینہ سے ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر صوفی نے صوف کا لباس پہنا ہو۔ امام قشیریؒ رسالہ قشیریہ میں لکھتے ہیں۔

"پشمینہ پہننا اس فرقے کی خصوصیت نہیں۔" گو قواعد کے لحاظ سے صوف سے صوفی کا اشتقاق صحیح ہے۔ لیکن صوفی کی وجہ تسمیہ صوف کا لباس نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ وجہ کثرت پر دلالت نہیں کرتی۔ کہ کثیر صوفیا کرام صوف کا لباس پہنا کرتے تھے۔

۵ - علامہ ابن جوزی کا خیال ہے۔ کہ لفظ صوفی "صوفتہ" سے نکلا ہے۔ صوفتہ کے نام سے ایک قبیلہ تھا جو ایام جاہلیت میں خانہ کعبہ کی خدمت کرتا تھا۔ اور حج کے زمانہ میں حاجیوں کی راہبری کرتا تھا۔" (تلبیس ابلیس)

علامہ ابن جوزی کا یہ خیال حقیقت سے بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس بات کا کوئی بھی قطعی ثبوت بہم نہیں پہنچایا جا سکتا کہ "صوفی" کا لفظ مروجہ معنی میں "صوفتہ" ہی سے نکلا ہے۔ کسی خاص قبیلہ کے لیے مخصوص لفظ کو اس قدر وسیع معانی میں استعمال کرنا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

٦ - مغربی محققین میں سے جنہوں نے اس موضوع پر خاص طور پر تحقیقات کی ہیں ان میں موجودہ صدی کے نولڈیکی (۱۹۳۰ء) اور پروفیسر نکلسن (۱۹۴۵ء) شامل ہیں۔ نولڈیکی کی رائے یہ ہے کہ "صوفی کا لفظ "صوف" سے ماخوذ ہے۔ اور یہ نام ان صوفیا کو دیا گیا' جنہوں نے عیسائی راہبوں کی متابعت میں ترک دنیا کے بعد "صوف" یعنی پشم کا لباس اختیار کیا تھا۔" ((Mystics of islam - p2.))

پروفیسر نکلس نے بھی نولڈیکی سے اتفاق کیا ہے۔ کہ صوفی کا لفظ "صوف" سے مشتق ہے۔ (ایضاً)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمان صوفیاء کرام نے عیسائی راہبوں کی کبھی بھی متابعت نہیں کی۔ اور نہ ہی راہبانہ زندگی بسر کی ہے۔ کیونکہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیاں نمونے کے طور پر صوفیاء عظام کے سامنے تھیں۔ اور صوفی وہی ہوتا ہے جو سنت رسولؐ سے بال برابر بھی دور نہ ہٹے۔ جب معلم انسانیتؐ اور صحابہ کرامؓ نے رہبانیت کو نہیں اپنایا تو صوفیا کس طرح آپؐ کی سنت کو چھوڑ کر عیسائی راہبوں کی اتباع کرتے۔ اگر کسی صوفی نے صوف کا لباس پہنا ہے تو وہ صرف اتباع رسولؐ اور پیروی صحابہؓ میں پہنا ہے۔

جیسا کہ حضرت علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں ایک حدیث نقل کی ہے۔

كان النبى صلى الله عليه وسلم يلبس الصوف نبی کریم ﷺ صوف کا لباس پہنا کرتے تھے۔" ایک اور حدیث میں ہے۔

علیکم یلبس الصوف تجدون حلاوۃ الایمان فی قلوبکم (باب چہارم)

"تم صوف کا لباس اختیار کرو۔ اپنے دلوں میں ایمان کی مٹھاس پاؤ گے۔"

اس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ صوفیاء کرام نے اگر صوف کا لباس زیب تن کیا تھا تو وہ صرف سنت رسولؐ سمجھ کر نہ کہ عیسائی راہبوں کی متابعت میں۔

۷۔ ایک تحقیق یہ ہے کہ صوفی کا لفظ "صفہ" سے مشتق ہے۔ اہل صفہ وہ نفوس قدسیہ تھے جو رسول اکرم ﷺ کے دور حیات میں مسجد نبوی کے صفہ پر شب و روز اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور نبی کریم ﷺ کی قربت میں رہتے تھے۔ ان کی تعداد مختلف اوقات میں ستر سے چار سو تک بتائی گئی ہے۔ یہ لوگ توکل علی اللہ کی حقیقی تصویر تھے۔ اور قناعت کے پیکر تھے۔ غربت کی حالت میں دنیا کی آسائشوں کو چھوڑ کر رجوع الی اللہ کئے ہوئے رضائے الٰہی پر مطمئن اور مسرور نظر آتے تھے۔ جب صحبت رسولؐ میں چہرہ انور کی زیارت کرتے تو سب بھوک پیاس دور ہو جاتی۔ ان کا اصول حیات صرف یہ تھا کہ "مرضی مولٰی از همه اولٰی" ان کی صفتوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بھی بیان فرمایا ہے۔

"وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ"

"اور ان لوگوں کو مت نکالو۔ جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں۔" (قرآن ٦ : ۵۲)

زہد و تقویٰ ان کا خاص وصف تھا۔ اور متاع دنیا سے بالکل بے نیاز ہو کر صرف ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ معلم انسانیت ﷺ سے کتاب و حکمت کی تعلیم حاصل کرتے۔ جہاد میں حصہ لیتے اور بعض اوقات انہیں مدینہ منورہ سے باہر تبلیغ دین، کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ ان میں بہترین مبلغ اسلام بھی تھے۔

صوفیا نے ان اصحاب صفہ کے طریق کار کو اپنایا- اس لیے اس نسبت سے "صفی" کہلانے لگے- جو بعد میں "صوفی" مشہور ہوگیا- یہ وجہ حقیقت کے زیادہ قریب ہے پس صوفی وہ ہوا جو اصحاب صفہ کا طرز عمل اپنائے- قلب میں "صفا" کی صفت سے متصف ہو اور گاہے بگاہے "صوف" کا لباس پہنے-

مقامات سلوک

تصوف میں آٹھ مقامات ایسے ہیں جنہیں مقامات سلوک کہا جاتا ہے- دیکھنا ہم نے یہ ہے کہ کیا یہ مقامات صوفیا نے خود ایجاد کیے ہیں یا حضور نبی رحمت ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عملی زندگی میں ان کی عکاسی کی ہے؟ اور قرآن و سنت میں یہ مقامات کس حد تک پائے جاتے ہیں-

مقامات سلوک درج ذیل ہیں:

١- توبہ ٢- ورع ٣- زہد ٤- فقر

٥- صبر ٦- توکل ٧- ایثار ٨- رضا

١- توبہ --- توبہ سلوک کا اولین مقام ہے- تصوف میں بیعت کا آغاز توبہ ہی سے ہوتا ہے- اور یہ طریقہ قرآن حکیم اور سنت نبویؐ کے عین مطابق ہے- ارشاد باری تعالیٰ ہے-

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا" .....(قرآن حکیم)

"اے ایمان والو! اللہ کی طرف توبہ کرو، خالص توبہ-" (قرآن ٦٦: ٨)

معلم انسانیت ﷺ نے فرمایا:

"اے لوگو! اللہ سے توبہ کرو- اور اس سے استغفار کرو- کیونکہ میں خود روزانہ سو مرتبہ اللہ سے توبہ استغفار کرتا ہوں--- (صحیح مسلم) ..... (سنت رسولؐ)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اگر مجھے معلوم ہو کہ صرف ایک شخص دوزخ میں جائے گا تو میں ڈروں گا کہ وہ ایک شخص میں ہی ہوں- اور اگر معلوم ہو کہ صرف ایک شخص جنت

میں، داخل ہو گا تو مجھے امید ہو گی کہ وہ ایک شخص میں ہی ہوں۔۔ (عمل صحابہؓ)
(کتاب اللمع از ابو نصر السراج: (م ۳۷۸ھ)

توبہ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ کہ بندہ اپنے رب کی طرف خلوص کے ساتھ متوجہ ہو کر اپنے گناہوں کی ایسی معافی مانگے جس میں ریا اور نفاق کا ذرا بھی عمل دخل نہ ہو۔ توبہ کی توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص رحمت کی وجہ سے ملتی ہے۔ اور یہ وہی در رحمت ہے جو خالق نے اپنی مخلوق کی نجات کے لیے کھول رکھا ہے۔ توبہ کا دروازہ موت تک کھلا ہے۔ اور جب موت کا فرشتہ حاضر ہو جاتا ہے تو یہ دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

حضرت ابی بن کعبؓ نے حضور نبی کریم ﷺ سے توبہ نصوح کا مطلب پوچھا تو حضورؐ نے فرمایا۔۔۔ "جب تم سے کوئی قصور ہو جائے تو اپنے گناہ پر نادم ہو پھر شرمساری کے ساتھ اس پر اللہ سے استغفار کرو اور آئندہ کبھی اس فعل کا ارتکاب نہ کرو۔"

تصوف میں توبہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے وہ اس لیے کہ قرآن و سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے اس کی یہ حیثیت ثابت ہے۔ لہٰذا تصوف کا کوئی پہلو بھی شریعت سے ہٹ کر نہیں بلکہ شریعت کے حقیقی منشاء و مقصود کے عین مطابق ہے۔

۲۔ ورع

یہ سلوک کا دوسرا مقام ہے۔ ہر مشتبہ چیز کو ترک کر دینا "ورع" کہلاتا ہے۔ اس کی تعلیم بھی قرآن و سنت میں دی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ" ......(قرآن حکیم)

"اور جو کوئی محرمات الٰہی کی تعظیم کرے تو اس کے لیے اس کے رب کے نزدیک بہتر ہے۔" (قرآن ۲۲: ۳۰)

حلال و حرام کی دو حدوں کے درمیان کچھ ایسی چیزیں ہیں جن پر نہ تو

حلال کا حکم صادق آتا ہے اور نہ حرام کا۔ ان اشیاء کو شبہات کہتے ہیں۔ ان سے پرہیز کرنا سالک کے لیے بہت ضروری ہے۔ محسن انسانیت ﷺ نے فرمایا:

"ان امور کو ترک کر دو جو شک میں ڈالیں اور وہ باتیں اختیار کرو جو شک و شبہ سے بالا تر ہوں۔" (ترمذی شریف) .... (سنت رسولؐ)

حضرت وابصہ رضی اللہ عنہ بن معبد نے حضور رسالت مآب ﷺ سے نیکی اور گناہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا: اے وابصہ تو پوچھنے آیا ہے کہ نیکی کیا ہے اور گناہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا۔ "جی حضور" یہ سن کر آپؐ نے میرے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا:

"اپنے دل سے پوچھ۔ "حضور ﷺ نے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔ اور پھر فرمایا: "نیکی وہ ہے جس سے دل مطمئن ہو اور سکون نصیب ہو۔ اور گناہ وہ ہے جو نفس میں خلش پیدا کرے اور دل میں کھٹکے۔ اگرچہ لوگ اس کے جواز کا فتویٰ دیں۔"

..........(عمل صحابہ رضی اللہ عنہ)

صوفیاء نے "ورع" کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ کیونکہ اسی سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً ممنوعات اور محرمات سے بچنا اور اجتناب کرنا تو ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ لیکن تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ مشکوک چیزوں سے بھی اپنے آپ کو بچایا جائے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "کوئی شخص اس وقت تک متقی نہیں بن سکتا جب تک گناہ میں پڑنے کے ڈر سے وہ چیز نہ چھوڑ دے جس میں گناہ کا اندیشہ ہو۔"

(ابن ماجہ - ترمذی شریف)

حضرت عبداللہ بن نعمان کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا۔

"بے شک حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں۔ اکثر لوگ ان کو نہیں جانتے۔ پس جو مشکوک چیزوں سے بچا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا۔ اور جو مشکوک چیزوں میں پڑا وہ حرام میں جا پڑا۔

تو وہ اس چرواہے کی مانند ہے جو چراہ گاہ کے گرد اپنے مویشی چراتا ہے بہت ممکن ہے کہ وہ (اپنے مویشی) اس (چراگاہ) میں چرانے لگے۔ خبردار رہو کہ ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں خبردار ------ تمہارے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ درست ہو گیا تو سارا جسم سدھر گیا۔ اور جب وہ بگڑ گیا تو سارا جسم بگڑ گیا۔ جان لو کہ وہ دل ہے۔" (بخاری و مسلم)

تصوف میں اصلاح قلب پر بہت زور دیا گیا ہے۔ حدیث مذکورہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اصلاح قلب کے لیے ورع یعنی مشکوک اشیاء سے اپنے آپ کو بچانا بہت ضروری ہے۔ اس لیے صوفی ہمیشہ مکروہات سے بچتا ہے۔ کیونکہ دل میں ذرا سی بھی کثافت اس کی طہارت و پاکیزگی کو میلا کر دیتی ہے۔ اور تزکیہ نفس کے لیے اس کا ہر وقت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اسی لیے حضورؐ نے فرمایا: "دل کی اصلاح سے ہی اعمال کی اصلاح ہو گی۔"

۳۔ زہد:

سلوک کا تیسرا مقام "زہد" ہے۔ اس کی تعلیم بھی قرآن و سنت میں دی گئی ہے۔ قرآن حکیم میں حیات دنیا کو "متاع الغرور" کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی دھوکے کا سامان۔ اس میں دنیا سے کم سے کم دل بستگی پیدا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اسی کا نام زہد ہے۔ یعنی بے رغبتی پیدا کر لینا کہ کسی چیز کو حقیر سمجھ کر توجہ نہ دینا۔ دل کو دنیا سے دور کرنے کو بھی زہد کہتے ہیں۔

مومن کو نہ تو دنیا چھوڑنے کا حکم ہے کہ سب کچھ ترک کر کے جنگل میں نکل جائے۔ اور نہ ہی دنیا میں دل لگانے کا حکم ہے۔ تصوف میں ترک دنیا یا زہد سے مراد یہ ہے کہ مومن اسی دنیا میں رہ کر اللہ سے لو لگائے۔ دنیا کو آخرت کی کھیتی سمجھتے ہوئے اس میں نیکی کا بیج بوئے نہ کہ اسے عشرت کدہ سمجھتے ہوئے بدی کاشت کرے۔ اور گناہ کی فصل تیار کرے۔ دنیا بڑی دلکش اور دلفریب ہے۔ اس میں نفسانی خواہشات کو نشوونما دینے کی بڑی صلاحیت موجود ہے۔ جس کے پیچھے شیطانی قوتیں

راز داری سے کام کر رہی ہیں۔ دنیا مومن کے لیے ایک امتحان گاہ ہے۔ اس کمرہ امتحان کو ہم چھوڑ نہیں سکتے۔ اس میں رہ کر ہم نے زندگی کا پرچہ حل کرنا ہے۔ اور وقت بھی مقرر ہے۔ اضافی وقت نہیں دیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ موت کے بعد نکلے گا۔ یہاں نگران اعلیٰ خود اللہ تعالیٰ ہے اور کراماً کاتبین (نیکی بدی لکھنے والے فرشتے) بھی ہر فعل تحریر میں لا رہے ہیں۔ ایسی آزمائش گاہ میں مومن کو بھلا عیاشی سوجھتی ہے! اسی لیے فرمایا کہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے جس سے وہ خالق کی مرضی اور امر کے مطابق رہائی پر خوش ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے رب کے بلاوے پر خوشی سے لبیک کہتا ہے۔ اس کے لیے موت بھیانک نہیں ہوتی بلکہ حسین ہوتی ہے۔ کیونکہ موت تو ایک بلاوا ہے۔ بندے اور اس کے رب کی ملاقات کا۔ اور جو لوگ اس دنیا میں دل لگا لیتے ہیں۔ محاسبے اور حساب و کتاب سے بے فکر دنیا کے چند دنوں کو ہی دائمی سمجھ لیتے ہیں۔ وہ بھلا موت کی تمنا کرتے ہیں---- ہرگز نہیں وہ موت سے ڈرتے ہیں چیختے چلاتے ہیں کہ ہائے یہ عیش و عشرت ان سے چھوٹ گئی۔ ترک دنیا تو بس یہی ہے کہ اس دنیا میں رہ کر ہر اس چیز کو چھوڑ دو جو بندے کو اپنے رب سے دور کرتی ہے۔ یہی زہد ہے۔ جو صوفیاء کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ حلال کو حرام ٹھہرانے کا نام زہد نہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" .... (قرآن حکیم)

"اور یہ دنیاوی زندگی تو محض کھیل تماشہ ہے۔ اور بے شک آخرت کا گھر وہی سچی زندگی ہے۔ اگر تم سمجھتے۔" (قرآن ۲۹ : ۶۴)

محسن انسانیت ﷺ نے فرمایا:

"دنیا میں اس طرح رہ گویا تو ایک مسافر ہے یا ایک راستہ عبور کرنے والا" مشکوۃ شریف)................ (سنت رسولؐ

صحابہ کرامؓ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں زہد کی صفت بہت زیادہ

تھی۔ وقت کا تقاضا اور صورت حال کی مجبوری تھی کہ آپ رضی اللہ عنہ نے خلافت کا بوجھ اٹھایا' آپ رضی اللہ عنہ نے بارہا اپنے خطبوں میں ارشاد فرمایا ---- اگر کوئی اس بار کو اٹھانے کے لیے تیار ہو جائے تو وہ نہایت خوشی کے ساتھ اس سے سبکدوش ہو جائیں گے۔
(خلفائے راشدین) (عمل صحابہؓ)

آپؓ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ "کاش میں گھاس کا تنکا ہوتا جسے بکری کھا جاتی"

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دوران خطبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ ان کے لباس میں تیرہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ زہد کے بلند درجے پر تھے۔ مال غنیمت کے ڈھیر تقسیم کر دیتے اور خود چادر جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے۔

حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہ ایک یہودی کے باغ میں محنت مزدوری کرتے اور رزق حلال کما کر لاتے۔ اور اکثر خیرات کر دیتے۔ صحابہ کرام کی زندگیاں زہد و تقویٰ کا کامل نمونہ تھیں۔

ابن ماجہ میں سہل بن سعد الساعدیؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔" یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ایسا عمل بتا دیجئے کہ میں اس پر عمل کروں تو اللہ مجھ سے محبت کرے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں۔" آپؐ نے فرمایا "دنیا سے بے رغبتی اختیار کر اللہ تجھ سے محبت کرے گا۔ اور اس چیز سے بے رغبتی اختیار کر جو لوگوں کے پاس ہے پھر لوگ تجھ سے محبت رکھیں گے۔"

دنیا عارضی ہے اس میں قیام عارضی اس کا مال و متاع عارضی۔ اس کی بے ثباتی کا اندازہ حضورؐ کے اس فرمان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مسلم شریف میں حضورؐ کا ارشاد ہے۔

"دنیاوی زندگی' اخروی زندگی کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے سمندر میں

انگلی ڈبو کر نکال لو تو جو تری اس کے ساتھ لگ جائے۔"

اب انگلی کے ساتھ چند قطرے پانی جو لگ جاتا ہے۔ اس کی حیثیت سمندر کے سامنے کیا ہے؟ بس دنیا کی حقیقت اور حیثیت آخرت کے مقابلے میں اتنی سی ہے۔ اور وہ انسان کتنا بدبخت ہے جو اتنی قلیل دنیا کے حصول کے لیے نہ حلال و حرام کا خیال رکھتا ہے اور نہ ہی اسے اللہ کا خوف مانع آتا ہے۔ تصوف میں زہد کو اس لیے بلند مقام حاصل ہے کہ قرآن و سنت میں اسے اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

۴۔ فقر

یہ سلوک کا چوتھا مقام ہے۔ قرآن و سنت میں اس کی تعلیم دی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"یَآاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ"

..........(قرآن حکیم)

"اے لوگو! تم ہی اللہ کے محتاج ہو۔ اور اللہ تو بے نیاز اور قابل ستائش ہے"

(قرآن ۳۵ : ۱۵)

معلم انسانیت ﷺ نے فرمایا:"

"اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ ----" فقر میرا فخر ہے۔ .... (سنت رسولؐ)

اس فَقر سے مراد غربت اور ناداری نہیں۔ کہ مومن ہر کس و ناکس کے سامنے دست سوال دراز کرتا پھرے۔ اس فقر سے مراد صرف اللہ کے سامنے محتاج ہونا ہے۔ دنیاوی امیدوں سے الگ ہو کر صرف اسی کا ہو رہنا فقر ہے۔ رجوع الی اللہ اور توکل الی اللہ۔ وہ ماسوا اللہ سے کلیۃً بے نیاز ہو جائے۔ مومن کے دل کے اندر جب زہد پیدا ہو کر اپنے اثرات ظاہر کرتا ہے تو مومن فقر کی حلاوت محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ اللہ کے دیئے پر قانع ہو جاتا ہے۔

فقیر دنیا کو منہ نہیں لگاتا کیونکہ لالچ طمع اور حرص ایسی بری خصلتیں مومن کے قریب نہیں آتیں۔ مومن اللہ کا فقیر ہوتا ہے۔ دنیا کی امیری یا غریبی اس

کے فقر پر بے اثر ہو جاتی ہے۔ اس کی قناعت کے سامنے ہر قسم کی احتیاج ہیچ ہو جاتی ہے۔

صحابہ کرامؓ میں اصحاب صفہ ایسے لوگ تھے جن کے شب و روز حالت فقر میں عبادت و ریاضت اور مجاہدہ نفس کرتے گزرتے تھے۔ کھانے پینے کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ بیت المال سے کچھ وظیفہ ملتا تھا جو ان کے لیے ناکافی تھا۔ انہیں اپنی زندگی میں دو کپڑے شاذو نادر ہی نصیب ہوئے۔ ایسے لوگوں کے لیے قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

"(صدقات) ان فقراء کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں مقید ہو گئے۔ وہ لوگ زمین میں چلنے پھرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ ان کی عفت کی بنا پر جہلا انہیں مالدار خیال کرتے ہیں۔ آپ انہیں ان کی صورت سے پہچانتے ہیں۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر بھیک مانگا نہیں کرتے۔ .... (قرآن ۲: ۲۷۳)

اصحاب صفہ کی تعداد مختلف اوقات میں مختلف رہی۔ ستر سے لے کر چار سو تک ایسے مہاجرین تھے جن کے پاس دنیاوی مال و دولت نہیں تھی۔ وہ بارگاہ رسالت میں حاضر رہتے تھے۔ اور جس کام کے لیے حکم ملتا اس کی تعمیل کرتے۔ محنت مزدوری کرتے جہاد کرتے مگر زیادہ وقت قرآن و سنت کی تعلیم حاصل کرنے میں گزارتے۔ ان کی رہائش کے لیے مسجد نبوی میں ایک چھپر بنوا دیا تھا۔ فقر و تنگدستی کے باوجود عزت نفس اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا جانتے ہی نہ تھے۔ صبرو شکر کے ساتھ وقت گزارتے۔ صاحب کشف المحجوب لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔

"(ایک دن) اصحاب صفہ کے پاس رسول اللہ ﷺ نے قیام فرمایا۔ جب ان کے فقر' جہد اور طہارت قلب کو دیکھا تو فرمایا---- (ایسے اصحاب صفہؓ تمہیں بشارت ہو۔ میری امت میں سے جو لوگ ان صفات سے متصف ہوں گے جن سے تم متصف ہو اور ان پر برضا و رغبت قائم رہیں گے تو وہ جنت میں میرے رفیق ہوں

گے۔" ....(عمل صحابہؓ)

تصوف میں فقر کا مقام بہت بلند ہے اور صوفیا اس صفت سے متصف ہوتے ہیں۔

۵۔ صبر

تصوف میں سلوک کا پانچواں مقام صبر کا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں "صبر" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ قرآن مجید میں صبر اور صبر کرنے والوں کے بارے میں کثیر تعداد میں آیات موجود ہیں اور معلم انسانیت ﷺ نے بھی اس کی خاص تعلیم دی۔

حق تعالٰی کا ارشاد ہے:

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ" ....(قرآن حکیم)

"اے ایمان والو۔ صبر کرو۔ (ایک دوسرے کو) صبر کی تلقین کرو۔ اور مل جل کر ربط و ضبط سے کام لو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔" (۳:۲۰۰)

مزید فرمایا

"اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ"

"بے شک صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر ملتا ہے۔" (قرآن ۳۹:۱۰)

ارشاد ہوتا ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ"

"بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

نبی رحمت ﷺ نے فرمایا

"اللھم اجعلنی شکورا واجعلنی صبورا" ......(سنت رسولؐ)

"اے اللہ مجھے شکر گزار بنادے اور صابر بنادے۔" ......(مشکوۃ شریف)

شعب ابی طالب میں رسول اللہ ﷺ کا صبر اور آپؐ کے ساتھ آپؐ کے خاندان کا

صبر، اہل طائف کی بدسلوکی پر صبر۔ حضورؐ کی مکی زندگی سراپائے صبر تھی۔ اور صحابہؓ نے کفار و مشرکین کے ظلم و ستم کو کمال صبرو تحمل سے برداشت کیا۔ شہادت عثمان غنیؓ اور شہادت امام حسینؓ صبرو شکر کی لازوال مثالیں ہیں۔ ......(عمل صحابہؓ)

فقر کے بعد جب اللہ سے محبت بڑھتی ہے تو آزمائش شروع ہو جاتی ہے۔ وہ اس لیے کہ زہد اور فقر کی وجہ سے دنیا کی محبت دل سے نکل جاتی ہے۔ دل دنیاوی آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ روحانی سرور حاصل ہوتا ہے۔ سب بت ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ محبت جو کئی جگہ تقسیم تھی اب اپنے اصلی مقام پر مرتکز ہو جاتی ہے۔ اور بندے کی اپنے خالق کے ساتھ محبت بڑھ جاتی ہے۔ اور جب محبت بڑھتی ہے تو آزمائش ضرور ہوتی ہے۔

"ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے خوف و ہراس میں مبتلا کرکے اور کبھی بھوک و تنگدستی کے ساتھ اور کبھی جان و مال کا نقصان کرکے اور کبھی فائدے کو گھاٹے میں تبدیل کرکے پس صابرین کو خوشخبری سنادو ------- کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو کہتے ہیں ---- ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جائیں گے۔" (قرآن ۲: ۱۵۵، ۱۵۶)

یہ پیغام ہے قرآن کا صابرین کے نام! صوفیاء کرام صبرو شکر کے پیکر ہوتے ہیں سالک جب اس مقام پر پہنچتا ہے تو مصائب دنیا پر کمال صبر کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ نفسانی خواہشات کو کچل دیتا ہے۔ اس کے دل میں حضرت بلالؓ، عمار بن یاسرؓ اور صہیبؓ رومی کا عشق تڑپ پیدا کرتا ہے۔ اس کا صبر اس کے لیے تقویت کا باعث بنتا ہے اور وہ استقلال کی چٹان بن جاتا ہے۔ یہی متقین کی راہ ہے اور یہی مقربین کا مقام ہے۔

٦۔ توکل

یہ سلوک کا چھٹا مقام ہے۔ قرآن و سنت میں اس کی تعلیم بڑے جامع انداز میں دی گئی ہے۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ" .... (قرآن مجید)

"اور توکل کر اس زندہ پر جسے کبھی موت نہیں آئے گی۔" (قرآن ۲۵ : ۵۸)

مزید فرمایا

"وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ"

"اور مومنین کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔" (قرآن ۳ : ۱۲۲)

نصرت الٰہی' اللہ پر بھروسہ کرنے والے مسلمان کے شامل حال ہوتی ہے۔ جب بندہ اپنے رب پر توکل کرتا ہے سخت مصائب اور تکالیف پر بھی استقلال، کی چٹان بن جاتا ہے تو پھر اللہ ہی اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔ فرمایا:

"وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ"

"اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا تو پھر وہی اس کے لیے کافی ہے۔" (قرآن ۶۵ : ۳)

حضور رسالت مآب ﷺ کی حیات طیبہ توکل علی اللہ سے عبارت تھی۔ مکی زندگی میں کفار و مشرکین کی عداوتوں' اذیتوں اور تکلیفوں میں حضورؐ نے صرف اللہ ہی پر توکل فرمایا۔ ایک ہزار جری کفار کے سامنے تین سو تیرہ نہتے صحابہؓ کو کھڑا کر دینا توکل ہی تھا۔۔۔ (سنت رسولؐ)

حضور کے وصال کے بعد جب کہ حالات نہایت مخدوش تھے۔ منافقین' مشرک قبائل اور یہودی ہر طرف سے مدینے کی اسلامی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازشیں کر رہے تھے۔ اس وقت خلیفہ اول حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا لشکر اسامہؓ کو مدینے سے روانہ کرنا توکل علی اللہ ہی تھا۔۔۔۔۔۔ (عمل صحابہؓ)

صحابہ کرامؓ ہر حال میں اللہ ہی پر توکل کرتے رہے۔ اصحاب صفہ کی بے شمار مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

صوفیاء نے ہمیشہ اللہ پر توکل کیا۔ نامساعد حالات میں بھی توکل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا وہ اپنے اعمال میں کوشش اور جدوجہد سے کام لیتے ہیں۔ ہاتھ پر

ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھتے اور خلوص اس قدر ہوتا ہے کہ اسباب پر بھروسہ نہیں کرتے بلکہ خالق اسباب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے سامنے حضورؐ کی زندگی کا ہر پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ وہ عشق رسولؐ میں اتنے آگے بڑھ گئے ہوتے ہیں کہ سنت کی روح کو سمجھ کر عمل کرتے ہیں توکل کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ پر بھروسہ کر کے انسان بیٹھ جائے کہ وہی رازق ہے وہ روزی دے گا بلکہ توکل کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ کسی کام کو پوری تدبیر اور کوشش سے انجام دیا جائے اور نتائج اللہ کے سپرد کر دیئے جائیں۔

ایک اعرابی نے حضورؐ سے پوچھا۔

اے اللہ کے رسولؐ! میں اپنے اونٹ کو باندھ کر توکل کروں یا اسے کھلا چھوڑ کر آپؐ نے فرمایا۔ پہلے تم اس کو باندھو پھر توکل کرو۔"

حضورؐ کا ارشاد ہے۔

"اِسْعَوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ عَلَیْکُمُ السَّعْیَ"

"کوشش کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تم پر کوشش کرنا فرض قرار دیا ہے" (مسند امام احمد)

توکل سے دلیری پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ متوکل انسان یہ سمجھتا ہے کہ نفع اور نقصان تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ توکل مومن کے دل میں استغناء پیدا کرتا ہے۔ لالچ طمع اور حرص و ہوا کو دور کرتا ہے۔ اس سے دل میں طمانیت پیدا ہوتی ہے۔ ان کی دعا تو یہ ہوتی ہے۔

"رَبَّنَا عَلَیْكَ تَوَکَّلْنَا وَ اِلَیْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ"

"اے ہمارے رب ہم نے تجھ ہی پر بھروسہ کیا۔ اور تیری ہی طرف رجوع کرلیا۔ اور تیری ہی طرف لوٹنے والے ہیں" (قرآن ۶۰ : ۴)

۷۔ ایثار

ایثار سلوک کا ساتواں مقام ہے۔ اس کے بغیر مقام رضا کا حصول ناممکن ہے۔ یہ محسنین کا شعار ہے۔ اور رضائے الٰہی کے حصول کا پیش خیمہ ہے۔ قرآن و

سنت میں اس کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور صحابہ کرامؓ آپس میں احسان و ایثار کا عملی نمونہ تھے۔ ان کی زندگیاں ان اعلیٰ خوبیوں سے عبارت تھیں۔ قرآن مجید نے ان کی اس خوبی کو بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے۔

"وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔" .... (قرآن مجید)

"اور وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ وہ خود شدید محتاج ہوں اور جو اپنے دل کی تنگی سے بچا لیا گیا۔ (یعنی جسے وسعت قلب عطا کی گئی) تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔" (قرآن ۵۹:۹)

ارشاد ہوتا ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ"

"بے شک اللہ عدل اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔" (قرآن ۱۶:۹۰)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ انصاف یہ ہے کہ تو لا الہ الا اللہ کہے اور احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر یہ نہیں تو وہ تو تمہیں دیکھتا ہی ہے اور تو دوسروں کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

"اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ"

"وہ لوگ جو خوشی میں اور تکلیف میں بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اور غصہ کو پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔" (قرآن ۳:۱۳۴)

نبی برحق ﷺ نے فرمایا۔ "تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی کچھ نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔ (صحیح بخاری)

حضورؐ نے خیر خواہی ' ایثار و احسان اور خدمت خلق کو ایمان کی بنیاد بنایا۔ آپؐ کی ساری زندگی ان صفات حمیدہ سے عبارت ہے۔ واقعہ طائف ہی کو لیجئے۔ پتھر کھا کر دعائیں دیں فتح مکہ کے موقع پر جانی دشمنوں کو معاف کر دیا۔ ایک کافر نے رات حضورؐ کے پاس پناہ لی۔ اسے مہمان رکھا۔ اس نے سیر ہو کر دودھ پیا۔ وہ رات کو بستر خراب کر گیا۔ مولائے کائنات ﷺ خود بستر صاف کرتے ہیں۔ جب صحابہؓ نے اس کام کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا تو فرمایا۔ "بھئی مہمان تو میرا تھا۔" ------

(سنت رسولؐ)

کیا صوفیاء کا یہی طریقہ نہیں ہے؟ کیا اولیائے اللہ نے اخلاق حسنہ کا مظاہرہ نہیں کیا؟ کیا تصوف اسی بات کی تعلیم نہیں دیتا ایثار کیا ہے؟ حضورؐ ایک بوڑھی عورت کا بوجھ اٹھائے جا رہے ہیں۔ وہ بوڑھی عورت حضورؐ کو کہتی ہے۔ بیٹا محمد ﷺ کے پاس مت جانا۔ جو بھی اس کے پاس جاتا ہے۔ اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دیتا ہے۔ تو تو بہت ہی نیک ہے بیٹا تم نے میرا بوجھ اٹھایا ہے۔ میں تمہیں یہی نصیحت کرتی ہوں کہ اس کے پاس نہ جانا"

حضورؐ نے فرمایا: مائی ! جس محمد ﷺ کا تو ذکر کر رہی ہے وہ میں ہی تو ہوں۔ وہ عورت حضورؐ کا یہ اخلاق دیکھ کر ایمان لے آئی۔

یہی اخلاق تھا جس اخلاق کے پیکر صوفیا کرام تھے اسی اخلاق کی بدولت لاکھوں کافروں کو نور ایمان سے منور کیا۔ تاریخ کے اوراق کھولیے۔ پتہ چلتا ہے کہ اگر یہ صوفیا کرام نہ ہوتے تو آج اسلام دنیا کے کونے کونے میں نظر نہ آتا۔ یہ سب فیضان اولیاء ہے کہ ہم کلمہ گو ہیں۔ یہی وہ جماعت ہے--- جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی نقیب ہے۔ یہ ہر دور میں رہی' ہر دور میں ہے اور قیامت تک رہے گی اس پر قرآن گواہ ہے۔

اگر صحابہؓ کے عمل کو دیکھا جائے۔ جو حضورؐ کے زمانے کے صوفی تھے۔ تو حیرت انگیز واقعات سامنے آتے ہیں۔ قرآن حکیم شاہد ہے۔ سورۃ حشر کی آیت ۹ اور

سورہ ال عمران کی آیت ۱۳۴ اسی بات کی نشاندہی کرتی ہیں۔

ایک جنگ کے موقع پر تین زخمیوں نے پانی مانگا۔ ایک کے پاس پانی کا پیالہ آیا تو دوسرے کی آواز آتی ہے "پانی" اس نے کہا پہلے اسے پلاؤ۔ جب پانی پلانے والا اس کے پاس جاتا ہے۔ اور وہ اس زخمی کے ہونٹوں سے پیالہ لگاتا ہے تو تیسرا زخمی بولتا ہے "پانی" دوسرے نے کہا پہلے اسے پلاؤ۔ جب وہ تیسرے کے پاس جاتا ہے تو وہ شہید ہو چکا ہوتا ہے پانی والا دوسرے کے پاس آتا ہے تو وہ بھی حق کو پیارا ہو چکا ہوتا ہے۔ جب وہ پہلے کے پاس آتا ہے تو اس کی روح بھی پرواز کر چکی ہوتی ہے----

یہی ایثار ہے۔ یہی احسان ہے۔ یہی خیر خواہی ہے۔ یہی تصوف کی روح ہے۔ اس کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی سے مقام رضا حاصل ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔

"وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ"

"ایسے احسان کرنے والوں ہی سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے"

صحابہؓ نے ہجرت کی۔ مکہ سے مدینہ آئے تو انصارؓ نے بے مثال ایثار کیا۔ یہاں تک کہ ایک صحابیؓ کی دو بیویاں تھیں انہوں نے ایک کو طلاق کے بعد اپنے مہاجر بھائی کے نکاح میں دینے کی پیشکش کی۔ جائیداد تقسیم کر دی۔ خود بھوکے رہ کر مہمانوں کو کھانا کھلایا۔ بچوں کو دلاسا دے کر سلا دیا.........(عمل صحابہؓ)

۸۔ رضا

"رضا" سلوک کا آٹھواں اور آخری مقام ہے۔ قرآن حکیم اور سنت رسولؐ میں کثرت سے اس کا ذکر ملتا ہے۔

"مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سِيْمَا هُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ"

............(قرآن مجید)

"محمد ﷺ اللہ کے رسولؐ ہیں- اور جو (نفوس قدسیہ) ان کے ساتھ ہیں- وہ کافروں پر سخت ہیں- آپس میں رحم دل ہیں- تو انہیں دیکھے گا رکوع کرتے' سجدہ کرتے اللہ کا فضل اور (اس کی) رضا چاہتے ہوئے- سجدوں کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں----- (۴۸:۲۹)" (عمل صحابہؓ)

جب مومنین اللہ کی رضا و خوشنودی کے طالب ہوتے ہیں- اور ہر طرح سے اللہ تعالیٰ کو راضی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی رضا رحمت بن کر نازل ہوتی ہے- اور خوشخبری سنائی جاتی ہے-

"لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ"

"بیشک اللہ ایمان والوں سے راضی ہوگیا" (قرآن ۴۸:۱۸)

مزید فرمایا:

"رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ"

"اللہ ان پر راضی ہوا اور وہ اللہ پر راضی ہوئے- یہی بہت بڑی کامیابی ہے-"

(قرآن ۶:۱۱۹)

مقام رضا کا حصول ولایت کی انتہا ہے- کیونکہ اس پر کامیابی نصیب ہوتی ہے- نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ ------------ تسلیم و رضا کا مجسمہ تھی- جس کی خوشخبری اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں دی-

"وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی"

"اور البتہ عنقریب آپؐ کا رب آپؐ کو اتنا دے گا کہ آپؐ راضی ہو جائیں گے-"

(قرآن ۹۳:۵)

آپؐ کی عبادت کی کثرت کو جب حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو عرض کیا-

"یا رسول اللہ! آپؐ تو معصوم ہیں- تو پھر اتنی عبادت کس لیے؟ فرمایا "اے عائشہؓ! کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

صحابہؓ کی زندگیاں اطاعت اللہ اور اطاعت رسولؐ میں بسر ہوئیں۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی میں شب و روز بسر کیے۔

تصوف کی یہ بنیادی حقیقتیں قرآن و سنت اور عمل صحابہؓ میں بڑی واضح اور جامع طور پر موجود ہیں کیا یہ مقامات تصوف دین کی اصل نہیں ہیں؟ کون کہتا ہے کہ تصوف بعد کی پیداوار ہے......؟ اسی تصوف کی تبلیغ و ترویج کے لیے نبی اکرم ﷺ مبعوث ہوئے۔ یہی کتاب و حکمت کی تعلیم تھی اور یہی تزکیہ نفس تھا۔ اسی مسلک کو لے کر اولیائے کرام اور صوفیائے عظام آگے بڑھے۔

نتیجہ بحث

حضرت علی بن عثمان الہجویری رحمۃ اللہ علیہ اپنی تصنیف کشف المحجوب میں لکھتے ہیں۔

> ''منکران طریقت سے پوچھو کہ انکار تصوف سے ان کی مراد کیا ہے؟ اگر صرف اسم (تصوف کے نام) سے انکار ہے تو خیر۔ اور اگر معنی سے انکار ہے تو اس کا مطلب مکمل شریعت پیغمبر ﷺ اور تمام اخلاق حسنہ کا انکار ہے۔''

(باب سوم۔ تصوف)

O

باب ۳

تصوف کا تاریخی و تدریجی ارتقاء

عہد نبوتؐ و دور صحابہؓ

تصوف کی ابتداء بعثت نبویؐ کے ساتھ ہی ہو چکی تھی۔ بلکہ حضورؐ کی بعثت کا مقصد ہی کتاب و حکمت کی تعلیم دینا اور تزکیہ نفس کرنا تھا اور یہ اعمال ہی تصوف کی بنیاد ہیں۔ اگر ہم حضور رسالت مآب ﷺ کی حیات طیبہ کا تجزیہ کریں۔ تو تصوف کے تمام رنگ نظر آجاتے ہیں۔

بچپن میں معصومیت' بے فائدہ کھیل کود سے اجتناب' پاکیزہ جوانی میں ایماندار تاجر کی حیثیت سے رزق حلال کا حصول اور طہارت و پاکیزگی کے ساتھ اخلاقِ حسنہ اور نیک کردار کا بے مثال نمونہ۔

عرب کے آلائش زدہ معاشرے میں ہمہ صفت موصوف' گدلے پانی میں کنول کے پھول کی طرح پاکیزہ' صادق اور امین' نبوت سے قبل غار حرا میں گوشہ نشینی۔ مادی دنیا سے بے نیاز ہو کر کچھ وقت تنہائی میں بیٹھ کر غور و فکر کرنا۔ معرفت خالق' معرفت کائنات اور معرفت نفس انسانی کا حصول۔ معرفت الٰہی کے لیے یا تو غار حرا تھی' یا شب بھر کی تنہائی یا رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف۔ کچھ وقت کے لیے دنیا سے کٹ کر خالق کی طرف روحانی عروج' رات کے سناٹوں میں' وقت تہجد کی خاموشی میں' چپکے چپکے اپنے خالق کو یاد کرنا تصوف ہی ہے۔ کفار کی ایذا رسانیوں پر صبر اور توکل کرنا ان کے ظلم کے بدلے دعا دینا' عفو و درگزر کی انتہا کر دینا' سراپائے رحمت اور پیکر تسلیم رہنا' جیتے جاگتے معاشرے میں رہ کر زہد' قناعت اور فقر کی بلندیوں کو چھو لینا۔ شدید اور نامساعد حالات میں بھی تبلیغ دین اور ترویج اسلام کے لیے مساعی جمیلہ' کیا یہ سب کچھ تصوف ہی نہیں۔؟ معلم انسانیت' مکارم اخلاق' منبع

جود و سخا' یاد الٰہی میں استغراق' خوف الٰہی میں توبہ و استغفار' محرمات الٰہی میں ورع متاع دنیا سے زہد و استغناء' فقر میں فخر' مصیبت میں پیکر صبر و رضا- اور توکل کی انتہا' زندگی سراپا ایثار و محبت' جہد مسلسل' مجسم صدق و صفا---- اور جلال و جمال کا حسین امتزاج ------ یہ سب کچھ کیا ہے----- یہ تصوف کی بنیادیں ہی تو ہیں جن پر دین اسلام کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہے۔

یہ وہ راہیں ہیں جن پر معلم انسانیتؐ کے شاگردان رشیدؓ چل کر منزل مقصود تک پہنچے- اور اسی سنت کو صحابہ کرامؓ نے اپنایا- اسی پیغام حق کو لوگوں تک پہنچایا- خلفائے راشدینؓ' صحابہ کبارؓ اہل بیت اطہار اور اصحاب صفہؓ کا یہی مسلک تھا- سلوک کا یہی راستہ ہے- جسے طریقت کا نام دیا گیا ہے- خلفائے راشدینؓ کی ساری زندگی ذکر و فکر' زہد و استغنا' توکل' صبر' رضا' مجاہدۂ نفس اور ورع و تقویٰ سے عبارت ہے- صدیق اکبرؓ کا ایثار' عمر فاورقؓ کا زہد و تقویٰ' عثمان غنیؓ کا صبرو توکل اور حضرت علیؓ کا استغناء اور صبر و رضا کس سے پوشیدہ ہے؟ تصوف کے تمام سلسلوں کے سالار سیدنا صدیق اکبرؓ اور سیدنا علی المرتضیٰؓ ہیں- پھر اصحابؓ صفہ جن کا طریق صوفیا نے اپنایا- شیخ ہجویریؒ کہتے ہیں- مسلک تصوف میں ہمارے امام سیدنا ابوبکر صدیقؓ ہیں-"

آپ سادہ مزاج اور فقیرانہ طبیعت کے مالک تھے- خلیفہ بننے سے پہلے محلے کے لوگوں کی بکریوں کا دودھ دوہ دیا کرتے تھے- پیوند لگا لباس ہوتا تھا- تواضع' انکسار اور زہد و تقویٰ میں بے مثل تھے- کپڑے کا کاروبار کرتے تھے مگر غرباء مساکین اور نادار رشتہ داروں میں خرچ کر دیتے تھے- غزوہ تبوک کا موقع آیا تو گھر کا سارا سامان اللہ کی راہ میں دے دیا- حضورؐ نے خوش ہو کر پوچھا- "صدیقؓ گھر میں کیا رکھا ہے" عرض کیا "اللہ اور اس کا رسولؐ" دور خلافت میں معمولی سے وظیفے پر گزر اوقات تھی- ایک دن بیوی نے آٹے کا حلوہ تیار کر کے پیش کیا تو پوچھا یہ کہاں سے آیا- عرض کیا روزانہ چٹکی چٹکی آٹا بچا لیتی تھی اس کا حلوہ تیار کیا ہے- یہ سن کر فرمایا:

اس کا مطلب ہے کہ بیت المال سے اتنا آٹا کم لیا جائے تو پھر بھی ہمارا گزارا ہو سکتا ہے۔ اس قدر درویشی اور صوفیانہ کردار سیدنا صدیق اکبرؓ کا تھا۔

خلیفہ دوم سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ جن کے نام سے قیصر و کسریٰ کے ایوان لرز جاتے تھے ان کی درویشی کا یہ عالم تھا کہ کاندھے پر مشک لئے جا رہے ہیں کہ بیوہ عورتوں کے گھر پانی بھرنا ہے۔ خلافت کا کام کر کے تھک جاتے تو مسجد کے فرش خاک پر لیٹ جاتے۔

علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ گھر میں دیر تک رہے باہر تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ پہننے کو کپڑوں کا دوسرا جوڑا نہ تھا انہی کپڑوں کو دھو کر خشک کر رہے تھے۔ حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ فاروق اعظمؓ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے میں نے دیکھا کہ ان کے تہہ بند پر بارہ پیوند لگے ہوئے تھے ان میں ایک پیوند چمڑے کا تھا۔

یہ صوفیانہ رنگ نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا یہ سادگی، درویشی اور زہد و قناعت یونان سے آئی تھی یا ایران سے؟ تصوف کا آغاز خود حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ غزوہ خندق کے موقع پر پیٹ پر تین تین پتھر باندھنے والا اللہ کا حبیبؐ اگر حجرہ مبارک میں ہے تو اپنی جوتی خود مرمت کر رہا ہے۔ دو جہانوں کا سردار ٹوٹی۔ پھوٹی چٹائی پر آرام فرماتا ہے تو چٹائی کے نشان کمر مبارک پر ابھر آتے ہیں۔ کئی کئی دن گھر میں چولہا نہیں جلتا۔ صرف کھجور اور پانی پر گزر اوقات ہوتی ہے۔ ایک مہمان آگیا تو حضورؐ نے امہات المومنینؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ کھانے کے لیے کچھ بھیجو۔ ہر حجرے سے جواب ملا۔ آج فاقہ ہے۔

خلیفہ سوم سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ، خوف الٰہی کا یہ عالم تھا کہ اس قدر روتے کہ ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ آپ کی حیا داری ضرب المثل بن چکی ہے۔ منبع سخاوت تھے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر دس ہزار دینار نقد ایک ہزار اونٹ اور ستر گھوڑے سازو سامان سمیت بارگاہ رسالت میں پیش کر دیئے۔ مدینہ

منورہ میں میٹھے پانی کا کنواں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ صبرو تحمل کے پیکر تھے۔ مصائب و آلام کو نہایت صبرو سکون کے ساتھ برداشت کرتے تھے۔ آپ کی شہادت اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

خلیفہ چہارم سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہ زہد و تقویٰ کے پیکر تھے۔ دنیا سے بے رغبتی جسے زہد کا نام دیا جاتا ہے۔ آپ کی ذات پر ختم تھی۔ آپ کے کاشانہ فقر میں دنیاوی شان و شوکت کا نشان تک نہ تھا۔ مسند احمد میں ہے کہ ایک مرتبہ بھوک نے بہت تنگ کیا تو مزدوری کے لیے نکلے۔ ایک ضعیف عورت اپنا باغ سیراب کرانا چاہتی تھی۔ اس کے پاس جا کر اجرت طے کی اور باغ کو پانی دینے لگے۔ یہاں تک کہ ہاتھوں میں آبلے پڑ گئے۔ جب اس محنت و مشقت پر مٹھی بھر کھجوریں ملیں تو بارگاہ رسالت میں حاضر ہو گئے۔ چونکہ اکیلے میں کھانے کی عادت نہ تھی حضورؐ کو ساری کیفیت بیان کی اور حضورؐ کو بھی کھانے میں شریک کیا۔ دور خلافت میں بھی ایسی ہی درویشی نظر آتی ہے۔ صوفیا نے بعد میں اسی مسلک کو اپنایا۔ یہ تہذیب مدینہ ہی تھی۔ جس کو اولیاء کرام نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ جو لوگ یونانی تہذیب و ثقافت کو صوفیاء پر انڈھیلتے ہیں یا ایران کے تمدن کے چھاپ لگاتے ہیں کیا وہ ان حقائق کو سامنے نہیں پاتے؟ اسلام ایک دین ہے۔ اس کا اپنا ایک نظام ہے۔ اپنی ایک ثقافت اور کلچر ہے۔ یہ کسی دوسرے مذہب سے کچھ لیتا نہیں۔ دیتا ہے۔ یہ ہماری اپنی کمزوریاں تھیں کہ اغیار کو ہم نے موقع دیا کہ وہ یونانی' مجوسی اور ہندووانہ تہذیب و ثقافت کے میلے کچیلے رنگ اسلامی تصوف کے اجلے لباس پر بکھیر دیں اور یہ کہ صوفی کو تارک الدنیا' رہبانیت کا شکار اور جوگی سادھو کے پیکر میں پیش کرکے یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی کہ صوفی کو شریعت سے کیا مطلب؟ درویش کو بیوی بچوں سے کیا واسطہ؟ اللہ لوک کا آبادی میں کیا کام -- وہ تو جنگلوں ویرانوں پہاڑوں کی غاروں اور چوٹیوں مین رہتے ہیں --

جوگی اتر پہاڑوں آیا --- صوفی کا مافوق الفطرت اور غیر اسلامی سا تصور

پیش کر کے تصوف اور اسلامی تہذیب و تمدن کو غلط رنگ دے دیا گیا۔

حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کا مقام طریقت میں بہت بلند ہے ان میں زہد، توکل، فقر، تسلیم و رضا اور ورع و تقویٰ کی صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ حضرت امام حسنؓ نے اقتدار صرف اس لیے حضرت معاویہؓ کو دے دیا کہ مسلمانوں میں خوں ریزی نہ ہو---- زہد و استغنا کی اس سے بڑھ کر اور مثال کیا ہو سکتی ہے! حضرت امام حسینؓ نے کمال صبرو استقامت سے جام شہادت نوش فرمایا: اور اہل بیت کے افراد کو اپنے سامنے شہید ہوتا دیکھ کر تسلیم و رضا کی معراج حاصل کی۔ حسنین کریمین رضی اللہ عنہما میں سلوک کے تمام محاسن موجود تھے۔ صحابہ کرامؓ کی زندگیاں اور شب و روز امت کے صلحاء صوفیاء اور اتقیاء کے لیے مشعل راہ ہیں۔ جن میں اصحاب صفہ کا کردار نہایت اہم ہے۔ جو ہمہ وقت معلم انسانیت، رہبر کامل اور ہادی برحق ﷺ کی صحبت نور میں حاضر ہو کر دین سیکھا کرتے تھے۔ جہاں شریعت و طریقت اور حقیقت و معرفت کے تمام اصول سمجھائے جاتے تھے۔ ان کی روحانی تربیت ہوتی تھی۔ حکمت سکھائی جاتی تھی۔ اصحاب صفہ ہی درحقیقت درس رسولؐ کے صحیح وارث تھے۔ جن کی علمی روحانی اور فکری صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ان میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت مصعب بن عمیرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت سالمؓ، حضرت ابو درداءؓ حضرت ثوبانؓ عمار بن یاسرؓ، حضرت بلالؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت مقدادؓ، حضرت حذیفہؓ بن الیمان، براء بن مالکؓ، حضرت عبداللہؓ بن انیس، حضرت خبابؓ، زیدؓ بن خطاب حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح، حضرت سلمان فارسیؓ، ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، عبداللہ بن ام مکتومؓ اور حارثہ بن نعمانؓ زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے مقام کا اندازہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ آپؓ فرماتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہم اصحاب صفہ کے پاس تشریف لائے۔ اس وقت ہمارا ایک ساتھی ہمیں قرآن پڑھ کر سنا رہا تھا۔ حضورؐ نے اشارہ فرمایا کہ حلقہ بنا کر بیٹھ جاؤ۔ ہم نے

حلقہ بنایا: اور حضورؐ کے سامنے مودب ہو کر بیٹھ گئے۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا: تم کیا کر رہے تھے؟ ہم نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ ﷺ یہ شخص ہمیں قرآن پڑھ کر سنا رہا تھا۔ اور ہمارے لیے دعا کر رہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ تم اپنے کام میں دوبارہ مصروف ہو جاؤ۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری امت میں ایک ایسی جماعت موجود ہے جس کے ساتھ بیٹھنے کا مجھے حکم ہوا ہے۔"

سبحان اللہ! یہ ہیں وہ نفوس قدسیہ جن کے نقش قدم کی پیروی صوفیا نے کی۔

خلیل رسول حضرت ابوذرؓ غفاری کی زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو فقرو درویشی کے سارے رنگ اس میں نظر آجاتے ہیں۔ آپ کے زہد و تقویٰ اور عشق رسولؐ کا یہ عالم تھا کہ حضورؐ نے انہیں مسیح الاسلام کا لقب عطا فرمایا آپ فقرو قناعت اور ورع و استغنا کے پیکر تھے۔ جو ہاتھ آتا راہ اللہ میں لٹا دیتے۔ محض ایک چادر زیب تن ہوتی۔ حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت میں بہت سی فتوحات ہوئیں۔ لوگوں میں مال غنیمت کی کثرت کی وجہ سے مال و دولت سے رغبت پیدا ہو گی تھی۔ ابوذرؓ یہ حالت دیکھ کر بے چین ہو جاتے آپ ہر وقت لوگوں کو سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین فرماتے۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جو عراق کے گورنر تھے حضرت ابوذرؓ سے ملنے آئے۔ وہ ان کو یا اخی یا اخی یعنی اے میرے بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن حضرت ابوذرؓ کہتے تھے کہ اس عہدے کے بعد آپ میرے بھائی نہیں رہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے پوچھا۔ وہ کیوں؟ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں کہ حاکم بننے کے بعد آپ نے کیا کیا؟ پہلے یہ بتائیں کہ آپ نے کوئی بڑا گھر تو نہیں بنایا۔ مویشیوں کے گلے تو جمع نہیں کئے اناج اور غلے کا ذخیرہ تو نہیں کیا؟ جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے ہر بات کا جواب نفی میں دیا تو فرمایا ہاں اب آپ میرے بھائی ہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں صرف دو کاموں سے

غرض رکھو- ایک طلب آخرت اور دوسرا کسب حلال- اس کے سوا کسی تیسرے کام کا ارادہ نہ کرو- اگر تمہارے پاس حلال ذریعے سے دو درہم آجائیں تو ایک درہم اپنے عیال پر خرچ کرو- اور ایک درہم اللہ کی راہ میں دے دو- تیسرے درہم کا کبھی ارادہ نہ کرو- یہ تمہیں نقصان دے گا۔

مدینہ منورہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ، مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور مصر میں حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص نے اسی تصوف کی درس گاہیں قائم کیں- جہاں پر تصوف کے چراغ جلے- اور ان چراغوں سے ہزاروں لاکھوں چراغ روشن ہوئے- اور اسلام کی یہ روشنی دنیا کے کونے کونے میں صوفیا کرام نے پہنچائی- جس کی ضیاپاشیوں سے جہالت و گمراہی کے اندھیرے چھٹ گئے۔

دور تابعین رضی اللہ عنہ

(۱۷۰ ہجری تک)

تابعین ہی وہ بزرگ ہستیاں تھیں جنھوں نے حضور رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ کو ایمان کی نظروں سے دیکھا، ان سے فیض حاصل کیا اور اس فیض کو آگے پہنچایا- دور تابعین، عہد صحابہؓ کے بعد شروع ہوتا ہے- اول تابعی حضرت اویس قرنیؒ دور صحابہ میں موجود تھے- اور وہ جنگ صفین میں حضرت علی المرتضیٰؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے ۳۷ ہجری میں شہید ہو گئے تھے۔

دور صحابہؓ کے وقت اسلامی مملکت بہت وسیع ہو چکی تھی- اسلام دور دور تک پھیل چکا تھا- مفتوحہ علاقوں کی تہذیب و تمدن، مال و دولت کی کثرت اور دنیاوی جاہ و جلال کے عروج نے اسلام کی فطری سادگی اور روحانیت کو بہت متاثر کیا- تابعین کی مقدس جماعت نے صحیح اسلامی روح اور اسلامی تشخص کو بیدار کرنے کی مساعی جمیلہ فرمائی- یہ حضرات اپنے اپنے دور اور علاقے میں زہد و تقویٰ اور فقر و استغنا کا

بہترین نمونہ قرار پائے۔ بیشتر اسلامی و شرعی علوم مثلاً تفسیر حدیث' فقہ اور کلام میں بھی ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ ان میں درج ذیل بزرگ ہستیاں ایسی ملتی ہیں جنھوں نے اپنے قول و عمل سے تصوف پر گہرا اثر ڈالا۔

۱۔ حضرت اویسؒ بن عامر القرنی۔

۲۔ حضرت امام زین العابدینؒ -

۳۔ حضرت امام قاسمؒ بن محمدؒ بن ابوبکرؓ -

۴۔ حضرت عامرؒ بن عبداللہ بصری۔

۵۔ حضرت مسروقؒ بن عبدالرحمٰن

۶۔ حضرت ہرمؒ بن حیان۔

۷۔ حضرت حسن بصریؒ

۸۔ حضرت مالکؒ بن دینار

۹۔ حضرت سعیدؒ ابن المسیب۔

ان حضرات نے لوگوں کو جو تعلیم دی اس کا خلاصہ یہ تھا۔

"دنیا میں رہ کر زخارف دنیا سے بے نیاز ہو جانا۔ یاد الٰہی اور خوف و توکل کو شعار بنانا۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی۔ تزکیہ نفس' تصفیہ اخلاق و کردار۔ عمل صالح پر استقامت' آخرت کو دنیا پر ترجیح دینا۔ دنیا کو دارالعمل جان کر آخرت کے لیے توشہ تیار کرنا۔ ذکر و فکر کرنا۔ اسلام کی تبلیغ و ترویج کے لیے دن رات کوشاں رہنا۔"

حضرت اویس قرنیؒ نبی کریم ﷺ کے عہد میں زندہ تھے۔ لیکن آپؒ کا ظاہری دیدار نہ کر سکے۔ حضورؐ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"قرن میں اویس نامی ایک شخص ہے۔ قیامت کے دن وہ بقدر قبیلہ ربیعہ و مضر کی بھیڑوں کے میری امت کے لوگوں کی شفاعت کرے گا۔

(کشف المحجوب باب دہم)

حضرت اویس قرنیؓ ساری عمر اپنی ضعیف والدہ کی خدمت کرتے رہے۔ آخری عمر میں کوفہ کی طرف چلے گئے اور بہت دنوں تک غائب رہے۔ پھر جنگ صفین کے موقع پر حضرت علیؓ کی فوج میں شریک ہوئے۔ جہاد کیا اور ۳۷ھ میں جام شہادت نوش فرمایا:

ہر وقت یاد الٰہی میں مستغرق رہتے۔ حب الٰہی، فقر، تسلیم و رضا اور توکل جیسی صفات سے متصف تھے۔ اعلائے کلمتہ اللہ کی خاطر جہاد میں شریک ہوئے۔ اور شہید ہوئے۔ ایک دفعہ نماز کے بعد عرض کیا۔ یااللہ میں ایسی آنکھوں سے جو زیادہ سوئیں اور ایسے پیٹ سے جو زیادہ کھائے پناہ مانگتا ہوں۔"

حضرت علیؒ بن حسینؓ بن علی المرتضیٰؓ المعروف زین العابدینؒ اسی دور کے سب سے زیادہ مکرم اور عابد تھے۔ میدان کربلا میں حضرت امام حسینؓ کو فرزندوں سمیت شہید کر دیا گیا تو سوائے حضرت زین العابدین کے مستورات کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ تقویٰ، زہد و استغنا صبر و شکر اور رضائے الٰہی جیسی اعلیٰ صفات سے متصف تھے۔ کثرت عبادت کی وجہ سے زین العابدین لقب پڑ گیا۔ کسی نے پوچھا۔ دنیا اور آخرت میں زیادہ سعادت کس کو نصیب ہے۔؟

فرمایا: "وہ شخص جو راضی ہو کر باطل کی طرف مائل نہ ہو۔ اور ناراض ہو کر حق کو نہ چھوڑ جائے۔"

حضرت امام قاسمؒ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے پوتے تھے۔ حضرت سلمان فارسیؓ سے فیض حاصل کیا۔ اس دور کے بہت بڑے فقیہ تھے۔ آپ کا شمار جلیل القدر تابعین میں ہوتا ہے۔ آپ نے اپنی پھوپھی حضرت عائشہ صدیقہؓ کے عائلی ماحول میں تربیت پائی۔

یحییٰ بن معاذؒ کا بیان ہے۔ کہ میں نے مدینہ میں قاسم بن محمد بن ابوبکرؓ سے زیادہ عالم و فاضل کسی اور کو نہیں پایا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں۔ کہ خلافت میرے بس کی چیز ہوتی تو میں اسے حضرت قاسمؒ کو سونپ دیتا۔ اور مسند

خلافت آپ کے لیے خالی کر دیتا۔" آپ عالم دین، فقیہہ دوراں، زاہد و عابد تھے۔

حضرت ہرمؒ بن حیان بزرگان طریقت میں سے ہیں۔ صاحب معاملت تھے۔ صحابہ کرامؓ کی صحبت نصیب ہوئی۔ حضرت اویسؒ قرنی سے بھی اکتساب فیض کیا۔

حضرت حسن بصریؒ مشہور تابعین میں سے ہیں۔ ان کو بہت سے صحابہ کی صحبت نصیب ہوئی۔ حضرت امام حسنؓ سے بیعت کی اور فیض حاصل کیا۔ آپ محدث، مفسر اور فقیہ بھی تھے۔ آپؒ نے ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کا دودھ پیا تھا۔ اور حضرت عمرؓ فاروق کے عہد خلافت میں پیدا ہوئے تھے۔

ورع، زہد، صبر، خوف الٰہی اور عبادت میں خشوع و خضوع ان کی نمایاں خوبیاں تھیں۔ ورع کے بارے میں فرماتے ہیں۔ "ورع کے تین مقام ہیں۔ اول یہ کہ بندہ غصہ یا خوشی ہر حال میں حق بات کہے۔ دوم یہ کہ وہ اپنے اعضا کو ان تمام باتوں اور کاموں سے باز رکھے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ سوم یہ کہ وہ ہمیشہ اس بات کا ارادہ کرے جس میں رضائے الٰہی ہو۔" مزید فرمایا۔ "ورع کا ایک لمحہ ہزار سال کی عبادت سے بہتر ہے۔" (تذکرۃ الاولیاء)

زہد اور صبر کے بارے میں ایک اعرابی نے آپ سے پوچھا تو ارشاد فرمایا:

"زہد یہ ہے کہ تو دنیا میں رہ کر اس سے دامن بچانے میں کامیاب ہو جائے اور اگر تو اس کی محبت میں بے خود ہو گیا۔ تو یہ ہلاکت ہے۔"

"صبر دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک مصائب میں صبر کرنا دوسرا ان چیزوں سے صبر کرنا جن سے باز رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔"

یہ سن کر اعرابی نے کہا۔ "اے ابو علی۔ تو زاہد ہے۔ میں نے تجھ سے بڑھ کر کوئی زاہد نہیں دیکھا۔" (کشف المحجوب (باب دہم)

عبادت میں خشوع و خضوع سے کام لیتے۔ حدیث شریف میں احسان (تصوف) کی جو تعریف آئی ہے وہ اس کے صحیح مصداق تھے۔ یعنی عبادت میں حضور

قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے دیکھتے۔ فرمایا: "جس نماز میں دل حاضر نہ ہو وہ نماز عذاب سے زیادہ قریب ہے۔" لوگوں نے پوچھا خشوع و خضوع کیا ہے؟
فرمایا۔ "ایک قسم کا خوف ہے جو دل میں بیٹھ جاتا ہے۔" (تذکرۃ الاولیاء)

حضرت سعیدؒ بن المسیب عالم، فقیہہ اور صاحب طریقت تھے انہوں نے فرمایا:

"اگر تیرا دین سلامت رہے تو دنیا کے اموال کے تھوڑے سے حصے پر بھی خوش ہو جا۔ جس طرح زیادہ دنیا حاصل کرنے والے دین برباد کر کے خوش ہوتے ہیں۔"

ایک دفعہ مکہ معظمہ میں تشریف فرما تھے۔ کسی نے پوچھا۔ وہ کونسی حلال چیز ہے جس میں حرام نہیں اور وہ کون سی حرام چیز ہے جس میں حلال نہیں۔ فرمایا: اللہ کا ذکر وہ حلال چیز ہے جس میں حرام نہیں۔ اور غیر اللہ کا ذکر وہ حرام چیز ہے جس میں حلال کا کوئی پہلو نہیں۔" (کشف المحجوب (دسواں باب)

آپ زاہد، صابر و شاکر، اور ہر دم یاد الٰہی میں اپنی زندگی بسر کرنے والے تھے۔ بہت زیادہ قناعت کرنے والے اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر کرنے والے تھے۔

نقیب اہل محبت، صاحب طریقت حضرت مالک بن دینارؒ خواجہ حسن بصریؒ کے مصاحب تھے۔ صوفیا میں بلند مقام رکھتے تھے۔ ان کی کرامات، ریاضات اور خصال بہت مشہور ہیں۔ ان کا قول ہے کہ۔ "اعمال میں سب سے زیادہ پیارا عمل خلوص ہے۔ کوئی عمل، عمل نہیں ہوتا جب تک اس میں خلوص نہ ہو۔ خلوص کو عمل کے ساتھ وہی نسبت ہے جو روح کو بدن کے ساتھ ہے۔ خلوص عمل باطن ہے اور طاعت عمل ظاہر۔ ظاہر باطن سے پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اور باطن کی قیمت ظاہر پر منحصر ہے۔" (کشف المحجوب گیارھواں باب)

دور تبع تابعینؒ

(۲۶۰ ہجری تک)

تبع تابعین کا دور اسلامی تصوف میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں تصوف یعنی خالص اسلامی نظام حیات کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ تزکیہ نفس' زہد و تقویٰ اور ذکر الٰہی میں مداومت پیدا کرنے کے لیے صوفیاء کرام نے باقاعدہ تربیت گاہیں قائم کیں۔ جو خانقاہوں کے نام سے مشہور ہوئیں۔ طریقت کے سلاسل قائم ہوئے اور ہر سلسلے نے باقاعدہ ایک تنظیم کے تحت مریدین کی اصلاح شروع کر دی۔ ذکر و فکر کے حلقے قائم ہوئے۔ اصول و ضوابط مقرر کئے گئے۔ اور تصوف کو بہت عروج ملا۔ اگر اس دور کو تاریخ تصوف اسلام کا "عہد زریں" کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ تصوف کا ماخذ اور منبع نبی آخر الزماں ﷺ کی ذات اقدس اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی عظیم ہستیاں ہیں۔ قرآن و سنت کے اس سیدھے راستے پر تابعین کی جماعت چلی۔ اسلامی ذوق و شوق کی وجہ سے یہ لوگ بہت زیادہ زاہد و عابد تھے۔ اور اس وجہ سے وہ عوام میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ گو "صوفی" کا لفظ پہلے بھی شاذ شاذ رائج تھا۔ لیکن عبادت' ریاضت اور توکل علی اللہ میں جب اس دور کے اتقیا نے مبالغہ سے کام لینا شروع کر دیا تو "صوفی" کا لفظ عمومی لحاظ سے رائج ہوا اور ان متقی لوگوں کے لیے بولا جانے لگا۔ اس دور میں جبکہ عباسی سلطنت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ اسلام کی سادہ زندگی اور روحانیت کو بہت نقصان پہنچا تو ان صوفیا نے زہد و ورع' توکل و استغنا اور عبادت و ریاضت کو اپنا شعار بنایا۔ لباس فاخرہ کی جگہ صوف کا پیوند شدہ لباس پہنا اور اصحاب صفہ کا سا طرز زندگی اپنایا اور صوفی کہلائے۔ ان کے سامنے نبی کریم ﷺ کی سادہ زندگی تھی۔ وہ چٹائی کا بچھونا' کھجور اور پانی پر گزر اوقات کرنا' کئی کئی دن چولہے میں آگ کا نہ جلنا' غزوہ خندق کے موقع پر پیٹ پر تین پتھروں کا باندھنا' اپنے لباس پر

خود پیوند لگانا۔ ٹوٹی ہوئی نعلین مبارک کو خود مرمت کر لینا۔۔۔۔ یہ سب کچھ کیا تھا؟ وہی طرز زندگی تھا جو صوفیاء نے اپنایا۔

صحابہؓ کی سادہ زندگی بھی ان کے سامنے تھی۔ امام حسنؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے۔ میں نے شمار کیا تو آپؓ کے تہبند پر بارہ پیوند لگے ہوئے تھے وہی فاروق اعظمؓ جنہوں نے اس دور کی دو سپر طاقتوں قیصرو کسریٰ کو شکست فاش دی اور ان کے وسیع علاقوں پر اسلامی پرچم لہرایا۔ زرو جواہرات کے انبار مال غنیمت میں آئے۔۔۔ سب تقسیم کر دیئے۔ اور چادر مبارک جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ غلام نے عرض کیا امیر المومنینؓ اپنے لیے کچھ رکھ لیا ہوتا۔ فرمایا پہلے یاد کرا دیتے۔" جب دستر خوان پر بیٹھے تو خشک روٹی۔ نمک اور پانی کا پیالا تھا۔"

اسی طرح اصحابؓ صفہ کا طرز زندگی بھی صوفیا کرام کے سامنے تھا۔ "تابعین کے دور کے بعد جب بدعات کا ظہور ہونے لگا تو ہر جماعت نے اپنے زہد کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا۔ زمانے کا یہ رنگ دیکھ کر خواص اہل سنت نے جو اپنے نفوس کو خشیت الٰہی سے مغلوب رکھتے تھے، ابنائے زمانہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور ان ہی کو "صوفیا" کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔" (قرآن اور تصوف)

اور سب سے پہلے بزرگ جن کو "صوفی" کے لقب سے پکارا جانے لگا وہ ابوہاشم کوفیؒ (متوفی ۱۵۰ھ) تھے۔ حضرت سفیان ثوریؒ کے دل میں ان کا بڑا احترام تھا۔ آپ نے ایک دفعہ فرمایا ولولا ابو ہاشم الصوفی ما عرفت دقائق الریاء

"اگر ابو ہاشمؒ صوفی نہ ہوتے تو میں دقائق ریا سے آگاہ نہ ہوتا۔"

(نفحات الانس از عبدالرحمٰن جامیؒ)

خانقاہ کی تعمیر

صوفیا کرام نے جب یہ دیکھا کہ بدعات سے عام مسلمان محفوظ نہیں ہیں

تو انہوں نے روحانی تربیت گاہوں کو منظم شکل دی۔ جسے بعد میں خانقاہوں کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ "ایسی سب سے پہلی خانقاہ حضرت ابو ہاشم صوفیؒ نے ملک شام کے ایک مقام "رملہ" میں تعمیر کی۔" (تاریخ تصوف در اسلام)

اسلام میں روحانی تربیت جسے تزکیہ نفس بھی کہا جاتا ہے، تعمیر اخلاق میں بنیادی اکائی کی حیثیت رکھی ہے۔ نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے نبوت کے بعد صحابہ کرامؓ کے لیے سب سے پہلی روحانی تربیت گاہ کوہ صفا کے دامن میں دارالارقم میں قائم کی۔ اس وقت جو بھی شخص حلقہ بگوش اسلام ہوتا وہ حضورؐ کے پاس درالارقم میں حاضر ہوتا دین اسلام سیکھتا اور روحانی تربیت حاصل کرتا۔ ہجرت کے بعد یہی تربیت گاہ مسجد نبوی میں قائم ہوئی۔ وہ صفہ تھا جہاں بیٹھ کر صحابہ کرامؓ تزکیہ نفس کرتے معلم انسانیت ﷺ سے علم حاصل کرتے اور اپنے سینوں کو نور معرفت سے منور کرتے۔

صحابہ کرام کے دور میں جب اسلام دور دور تک پھیلنے لگا تو ایسی تربیت گاہوں اور دینی مدرسوں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ چنانچہ مدینہ منورہ کے علاوہ مکہ معظمہ، کوفہ بصرہ، مصر، شام اور یمن میں خلفائے راشدینؓ نے صحابہ کرام کو معلم بنا کر بھیجا۔ جنہوں نے عوام کو قرآن و سنت کی تعلیم دی، تزکیہ نفس اور اخلاق و کردار کی اصلاح کی۔ مثلاً "مدینہ منورہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ نے باقاعدہ تربیت گاہیں قائم کیں۔ ان کے پاس صحابہؓ آتے اور فیض حاصل کرتے۔ مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مدرسہ قائم تھا۔ جہاں کثیر تعداد میں طلبہ کتاب و حکمت کی تعلیم حاصل کرتے۔ فسطاط (مصر) میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، بصرہ میں حضرت انسؓ بن مالک، شام میں حضرت عبدالرحمٰن الاشعریؓ، یمن میں حضرت طاؤسؒ بن کیسان الجندی اور کوفہ کے شہر میں حضرت علیؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے دینی مدارس اور روحانی تربیت گاہیں قائم تھیں۔" (تاریخ فقہ اسلامی)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو حضرت عمر فاروقؓ نے کوفہ میں قائم کی گئی تربیت گاہ میں معلم بنا کر بھیجا تو صحابہؓ سے ارشاد فرمایا۔ میں نے اہل کوفہ کو اپنے آپ پر ترجیح دی اس لیے عبداللہ بن مسعودؓ کو مدینہ سے کوفہ بھیج رہا ہوں۔"

دور صحابہؓ کے بعد تابعین اور تبع تابعین نے بھی ایسی درس گاہیں اور تربیت گاہیں قائم کیں۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

مدینہ منورہ میں ------ حضرت سعیدؒ بن المسیب ' حضرت عروہؒ بن زبیرؓ حضرت ابوبکرؒ بن عبدالرحمٰن بن حارث ' حضرت امام زین العابدینؒ بن الحسین بن علیؓ' حضرت سالمؒ بن عبداللہ بن عمرؓ' حضرت امام قاسمؒ بن محمد بن ابوبکر صدیقؓ اور حضرت نافعؒ مولیٰ عبداللہ بن عمرؓ

مکہ مکرمہ میں --------- حضرت مجاہدؒ بن جبیر' حضرت عکرمہؒ مولیٰ ابن عباس اور حضرت عطا بن ابی رباح

کوفہ میں ----------- حضرت علقمہؒ بن قیس' حضرت مسروقؒ اور حضرت اسودؒ بن یزید النخعیؒ

بصرہ میں ----------- حضرت حسن بصریؒ ' حضرت محمدؒ بن سیرین اور حضرت قتادہؒ

شام میں ----------- حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ حضرت رجاؒ بن حیوۃ الکندی اور مکحولؒ بن ابی مسلم

مصر میں ----------- حضرت ابو الخیر مرثد بن عبداللہ ' حضرت ذوالنونؒ مصری۔

یمن میں ------------- حضرت وہبؒ اور حضرت یحییٰؒ بن کثیر۔

ان کے علاوہ حضرت امام ابو حنیفہؒ ' حضرت امام مالکؒ ' حضرت معروف کرخیؒ ' حضرت مالک بن دینارؒ ' حضرت شفیق بلخیؒ ' حضرت امام شافعیؒ ' حضرت سری سقطیؒ ' حضرت جنید بغدادیؒ ' حضرت بایزید بسطامیؒ - حضرت ابراہیم ادھمؒ حضرت

ابوبکر شبلی۔ حضرت رابعہ بصریؒ حضرت امام احمد بن حنبلؒ، حضرت حبیب العجمیؒ۔ حضرت بشر بن حارث الحافیؒ اور حضرت احمد بن حضرویہ بلخی وغیرھم نے بھی روحانی تربیت کے لیے خانقاہیں قائم کیں۔

خانقاہ فارسی لفظ ہے۔ اور یہ "گھر" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اسے عبادت خانہ کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ دینی مدارس، روحانی تربیت گاہوں اور عبادت گاہوں کے لیے "خانقاہ" کا لفظ چوتھی صدی ہجری میں استعمال کیا گیا۔

دوسری صدی ہجری کے صوفیاء میں حضرت ابوہاشم صوفیؒ کے بعد جن صوفیا نے شہرت پائی ان میں حضرت رابعہ بصریؒ (۱۸۵ھ)، حضرت ذوالنون مصریؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت ابوبکر شبلیؒ زیادہ مشہور ہیں۔

حضرت رابعہ بصریؒ نے یہ درس دیا کہ اللہ کی عبادت جنت کی طمع اور جہنم کے خوف سے بالاتر ہو کر کی جائے۔ صرف رضائے الٰہی پیش نظر ہو۔ ایک دفعہ آپؒ نے دعا کی۔

"اے اللہ! اگر میں تیری عبادت جہنم کے ڈر سے کرتی ہوں تو مجھے جہنم کی آگ میں ڈال دے۔ اور اگر میں تیری عبادت جنت کے لالچ میں کرتی ہوں تو مجھے ہمیشہ کے لیے اس سے محروم کر دے اور اے میرے مالک! اگر میں تیری عبادت صرف تیری محبت میں کرتی ہوں تو مجھے اپنے جمال ازلی سے محروم نہ رکھنا۔" (تذکرۃ الاولیاء)

"فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ"

"اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو لائے گا جو اللہ کی محبوب ہوگی۔ اور وہ بھی اللہ سے محبت رکھتی ہوگی۔ نرم دل ہوں گے مسلمان پر اور سخت اور تیز ہوں گے کفار پر۔"
(قرآن ۵ : ۵۴)

حضرت رابعہ بصریؒ نے تصوف کی بنیاد حب الٰہی اور رضائے الٰہی کو قرار

دیا ہے۔ صوفیا میں حضرت ذوالنون مصریؒ کی ذات گرامی بہت بلند مقام کی حامل ہے وہ فنافی اللہ کو تصوف میں بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے ارشادات اس حدیث نبویؐ کی عکاسی کرتے ہیں۔ جس میں حضور رسالت مآب ﷺ نے فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

"جب میں اس (بندے) سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا وہ کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ پکڑتا ہے۔ اور اس کا پاؤں جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں اس کو ضرور دوں گا۔ اور اگر وہ میری پناہ چاہے گا تو میں اسے ضرور پناہ دوں گا۔" (صحیح بخاری)

حضرت بایزید بسطامیؒ تبع تابعین کے مشائخ طریقت میں سے تھے۔ صوفیا میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ ان کے بارے میں جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں۔

"ابو یزید منا بمنزلة جبریل من الملائكة"

"ہم میں ابو یزیدؒ کو وہ درجہ حاصل ہے جو جبرئیلؑ کو فرشتوں میں" (کشف المحجوب)

بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار میں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی۔ "اے اللہ! تجھ تک رسائی کس طرح ہے؟" آواز آئی۔ دَعْ نَفْسَكَ وَتَعَالٰى "اپنے نفس کو چھوڑ اور مجھ تک آ۔"

آپ نے طریقت میں مقام فنا کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ آپ نے ایک دفعہ فرمایا۔ "میں نے تیس سال تک مجاہدہ کیا۔ علم اور اس کی متابعت سے زیادہ مشکل کوئی چیز نہیں دیکھی۔"

دور تبع تابعین میں حضرت جنید بغدادیؒ بھی بڑے پائے کے بزرگ گزرے ہیں۔ حضرت شیخ ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں ان کو طریقت میں شیخ المشائخ اور امام آلائمہ لکھا ہے۔ اہل ظاہر اور اہل باطن میں مقبول تھے۔ فنون علم، اصولِ فروغ اور معاملت میں کامل تھے۔ حضرت سریؒ سقطی کے مرید تھے۔ ایک دفعہ لوگوں نے حضرت سریؒ سے پوچھا۔ "کیا

مرید کا مقام کبھی اپنے پیر سے بھی بلند تر ہو سکتا ہے؟" فرمایا- بے شک ہو سکتا ہے- اس کی بین دلیل یہ ہے کہ "جنیدؒ میرے مرید ہیں مگر مجھ سے اونچا مقام رکھتے ہیں-" (کشف المحجوب)

حضرت سری سقطیؒ کی حیات میں لوگوں نے جنیدؒ سے درخواست کی کہ وہ وعظ فرمائیں- مگر انہوں نے یہ بات نہ مانی- اور فرمایا کہ جب تک میرے شیخ طریقت موجود ہیں میں کلام نہیں کر سکتا-" ایک رات خواب میں حضور نبی کریم ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا- تو حضورؐ نے فرمایا-

"جنید لوگوں کو وعظ و نصیحت کرو- اللہ نے تمہارے کلام کو خلق کے لیے ذریعہ نجات بنایا ہے-" صبح ہوئی تو حضرت سریؒ کا پیغام آیا کہ "جنید اب لوگوں کو نصیحت کرو کہ اب تو حضورؐ کا حکم ہے بجا لاؤ-" آپ نے بغداد کے لوگوں کو وعظ کرنا شروع کر دیا- (کشف المحجوب (گیارھواں باب)

یہ اس بات کی دلیل بھی ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالٰی شیخ کامل کو مریدوں کے احوال سے باخبر بھی رکھتا ہے حضرت جنیدؒ نے اپنے شیخ سے پوچھا کہ آپ کو کیسے پتہ چل گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے وعظ کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے- تو حضرت سریؒ نے فرمایا- "جنید مجھے خواب میں اس کی اطلاع کر دی گئی تھی-" (نفحات الانس)

حضرت ابوبکر شبلیؒ بھی تبع تابعین میں سے تھے- اور حضرت جنید بغدادی کے مرید تھے- ان کے متعلق حضرت جنیدؒ نے فرمایا- **لکل قوم تاج و تاج هذا القوم شبلی** (نفحات الانس)

"ہر قوم کا ایک تاج ہوتا ہے- اور اس قوم کا تاج شبلیؒ ہے- عارف کے بارے میں شبلیؒ فرماتے ہیں- "عارف وہ ہے جو بغیر حق کے نہ بولتا ہے- اور نہ دیکھتا ہے اور نہ سوائے ذات حق کے اور کسی کو اپنے نفس کا محافظ پاتا ہے- اور نہ اس کے غیر سے کوئی بات سنتا ہے-"

سلاسل طریقت کا آغاز

دور تبع تابعین میں مختلف سلاسل طریقت کا آغاز بھی ہوا۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱	سلسلہ عجمیہ (۱۵۰ھ)	از حضرت حبیب عجمیؒ
۲	سلسلہ ادھمیہ (۱۵۰ھ)	از حضرت ابو اسحاق ابراہیم بن ادھمؒ
۳	سلسلہ عیاضیہ (۱۷۰ھ)	از حضرت فضیل بن عیاضؒ
۴	سلسلہ کرخیہ (۱۹۰ھ)	از حضرت معروف بن فیروز الکرخیؒ
۵	سلسلہ محاسبیہ (۲۳۰ھ)	از ابو عبداللہ حارث بن اسد محاسبیؒ
۶	سلسلہ طیفوریہ (۲۴۰ھ)	از ابویزید طیفور بن عیسیٰ بسطامیؒ
۷	سلسلہ سقطیہ (۲۴۵ھ)	از ابو الحسن سری سقطیؒ
۸	سلسلہ جنیدیہ (۲۷۰ھ)	از حضرت جنید بن محمد بغدادیؒ
۹	سلسلہ نوریہ (۲۸۰ھ)	از ابوالحسن احمد بن محمد نوریؒ

یہ سلاسل طریقت بعد میں موجودہ چار سلسلوں میں مدغم ہو گئے۔ اور آج ان کی شہرت پس منظر میں چلی گئی ہے۔ ان کی جگہ درج ذیل سلاسل طریقت نے لے لی ہے۔

۱	سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ	از حضرت بہاؤ الدین نقشبندیہ بخاریؒ و حضرت امام ربانی شیخ احمد مجدد الف ثانی فاروقی سرہندیؒ
۲	سلسلہ عالیہ قادریہ	از حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ
۳	سلسلہ عالیہ چشتیہ	از حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ۔

۴ سلسلہ عالیہ سہرورِیہ از حضرت شہاب الدین سہروردیؒ

ان کے علاو سلسلہ اویسیہ بھی مشہور ہے۔ جس کا آغاز حضرت اویس قرنیؓ سے ہوتا ہے۔ ان سلاسل طریقت میں سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے شروع ہوتا ہے۔ باقی تینوں سلسلے اور سلسلہ اویسیہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے شروع ہوتے ہیں۔ ان تمام سلاسل طریقت کی ابتداء مرشد حقیقی، رہبر کامل نبی آخر زماں حضور رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ حضورؐ کے بعد رشد و ہدایت کا یہ فیض خلفاء راشدینؓ، اہل بیت اطہارؓ اور صحابہ کرامؓ کے ذریعے مختلف سلسلوں کے تحت آگے بڑھتا چلا گیا۔ جس کی ضیاپاشیوں نے دنیا سے کفرو شرک اور جہالت و گمراہی کے اندھیرے دور کئے۔ اور یہ فیض رسالتؐ قیامت تک جاری و ساری رہے گا۔ کیونکہ حضورؐ کی نبوت و رسالت اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا۔ حضور نبی رحمت نور مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہؓ ہدایت کے ستارے ہیں۔ فرمان رسالتؐ ہے۔ "میرے صحابہؓ ستاروں کی طرح ہیں۔ تم جس کا بھی اتباع کرو گے ہدایت پاؤ گے۔"

اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت سورۃ التوبہ کی آیت ۱۰۰ میں بھی کر دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ"

"مہاجرین و انصار سے وہ (صحابہ کرامؓ) جو سب سے آگے آگے سب سے پہلے (ایمان لائے) اور وہ جنہوں نے راستبازی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔ (ان سب سے) اللہ راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔ اور (اللہ تعالیٰ) نے تیار کر رکھے ہیں ان کے لیے باغات جن کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔"

اس آیت کریمہ کی رو سے صحابہ کرامؓ کی پیروی تابعین نے کی- اور ان کی تبع تابعین اور صوفیا کرام نے- پس اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو گیا- اس طرح حضورؐ کے بعد صحابہ کرامؓ سے سلاسل طریقت کا آغاز ہوا- ان صحابہؓ سے جو سلاسل طریقت جاری ہوئے وہ چند واسطوں کے بعد ان سلاسل میں مدغم ہو گئے جن کے سرخیل حضرت سیدنا ابوبکر صدیق اور حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما ہیں- مثال کے طور پر درج ذیل چند سلاسل کا ذکر کیا جاتا ہے-

۱	حضرت ابوبکر صدیقؓ	حضرت بایزید بسطامیؒ عن حضرت امام جعفر صادقؒ عن حضرت امام قاسمؒ عن حضرت سلمان فارسیؓ عن حضرت ابوبکر صدیقؓ
۲	حضرت عمر فاروقؓ	حضرت بایزید بسطامیؒ عن شیخ امین الدین شامیؒ عن حضرت عبداللہؓ عن حضرت عمر فاروقؓ
۳	حضرت عثمان غنیؓ	حضرت شفیق بلخیؒ عن شیخ ابراہیم بن ادھمؒ عن شیخ کمیلؒ بن زیاد عن حضرت عثمان غنیؓ
۴	حضرت علی المرتضیٰؓ	حضرت فضیلؒ عن حضرت عبدالواحدؒ عن خواجہ حسن بصریؒ عن حضرت امام حسنؓ عن حضرت علی المرتضیٰؓ
۵	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ	حضرت شیخ داؤد طائیؒ عن شیخ ابراہیم بن ادھمؒ عن امام سفیان ثوریؒ عن امام ابراہیم نخعیؒ عن امام علقمہؒ بن قیس عن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

۶ حضرت زبیرؓ بن عوام

شیخ داؤد طائیؒ عن امام ابو حنیفہؒ عن شیخ عطارؒ بن رباح عن عبداللہ بن زبیرؓ (صحابی) عن حضرت زبیرؓ بن عوام۔

۷ حضرت سلمان فارسیؓ

شیخ عطارؒ بن رباح عن امام قاسمؒ عن امام عروہؓ بن زبیر عن حضرت سلمان فارسیؓ۔

۸ حضرت عبداللہ بن عباسؓ

امام احمد بن حنبلؒ عن امام سفیان ثوریؒ عن حضرت ابو محمد عمرو فہمی عن حضرت عبداللہ بن عباسؓ

۹ حضرت امام حسن بن علیؓ

شیخ حبیب عجمیؒ عن امام حسن بصریؒ عن حضرت امام حسنؓ

۱۰ حضرت امام حسین بن علیؓ

شیخ عبدالواحدؒ عن خواجہ حسن بصریؒ عن حضرت امام حسینؓ

۱۱ حضرت عبداللہ بن عمرؓ

شیخ ابراہم بن ادھمؒ عن امام مالکؒ عن حضرت نافعؒ عن حضرت عبداللہ بن عمرؓ

۱۲ حضرت جابر انصاریؓ

حضرت خواجہ ذوالنون مصریؒ عن شیخ اسرافیلؒ عن شیخ ابو عبداللہ محمدؒ عن حضرت جابر انصاریؓ۔

۱۳ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ

حضرت داؤد طائیؒ عن امام ابوحنیفہؒ عن شیخ عطار بن رباحؒ عن حضرت عبداللہ بن زبیرؓ۔

۱۴ حضرت انسؓ بن مالک

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ عن امام حسن بصریؒ عن شیخ عمرانؒ بن حصین عن

حضرت انس بن مالکؓ۔

۱۵	حضرت ابو ہریرۃؓ	حضرت ابراہیم بن ادھم عن شیخ کمیل بن زیادؒ عن حضرت ابو ہریرۃؓ (صحابی رسولؐ)

اسی طرح فقہا اور آئمہ مجتہدین سے بھی سلاسل طریقت کا آغاز ہوا اور وہ سلسلے بھی انہیں سلسلوں میں شامل ہو گئے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فقہا اور آئمہ مجتہدین، صوفیا میں شمار نہیں ہوتے وہ تو علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک بہت بڑا مغالطہ ہے جو شریعت اور طریقت کو الگ الگ کرنے کے لیے پیدا کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ تمام فقہا صوفی تھے۔ روحانی اور باطنی لحاظ سے بلند مقام رکھتے تھے اور صاحب نسبت تھے۔ آئمہ مجتہدین میں زیادہ مشہور درج ذیل ہیں۔ جن سے سلسلہ ہائے طریقت جاری ہوئے۔

۱	حضرت امام جعفر صادقؓ	حضرت خواجہ بشر حافیؒ عن امام احمدؒ بن حنبل عن امام شافعیؒ عن حضرت امام جعفر صادقؓ
۲	حضرت امام ابو حنیفہؒ	خواجہ فضیلؒ بن عیاض عن حضرت داؤد طائیؒ عن امام ابو حنیفہؒ
۳	حضرت امام مالکؒ	حضرت خواجہ ذوالنون مصریؒ عن حضرت امام مالکؒ
۴	حضرت امام شافعیؒ	خواجہ بشر حافیؒ عن امام احمد بنؒ حنبل عن امام شافعیؒ
۵	حضرت امام احمدؒ بن حنبل	حضرت بشر حافیؒ عن حضرت امام احمد بن حنبلؒ

ان فقہی اماموں نے خود بھی روحانی تربیت حاصل کی۔ اور اپنے اپنے شیخ

طریقت سے فیض حاصل کیا۔ مثلاً حضرت امام جعفر صادقؒ نے اپنے والد گرامی حضرت امام باقرؒ سے اور انہوں نے اپنے والد حضرت امام زین العابدینؒ سے بیعت کی۔ اور ان کی بیعت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے تھی۔ حضرت امام جعفر صادقؒ نے حضرت امام قاسمؒ بن محمدؒ بن ابوبکر صدیقؓ سے بھی روحانی فیض حاصل کیا۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ نے حضرت شیخ ہرمؒ بن حیان سے بیعت طریقت کی اور وہ مرید تھے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے۔ آپؒ نے حضرت شیخ عطار بن رباحؒ سے بھی فیض حاصل کیا۔ جو حضرت عبداللہ بن زبیر صحابی رسولؐ کے مرید تھے۔

حضرت امام مالکؒ کی بیعت طریقت حضرت نافعؒ سے تھی۔ اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ صحابی رسولؐ سے فیض حاصل کیا تھا۔ اسی طرح حضرت امام شافعیؒ نے حضرت امام جعفر صادقؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے بیعت طریقت حضرت امام شافعیؒ سے کی۔ اور روحانی و باطنی عروج حاصل کیا۔

ان فقہا کے مدارس اور خانقاہوں میں جہاں قرآن و حدیث اور فقہی مسائل سمجھائے جاتے تھے وہاں مریدین اور شاگردوں کا تزکیہ نفس بھی کیا جاتا تھا۔ تاکہ لوح قلب پر کتاب و حکمت کی تعلیم ثبت ہو جائے۔ لیکن اسلام دشمن قوتوں نے شریعت اور طریقت کو الگ الگ کرنے کے لیے جو تاثر قائم کیا اس نے بہت سے لوگوں کو اس مغالطے میں مبتلا کر دیا کہ علماء و فقہا اور آئمہ مجتہدین' صوفیا میں شمار نہیں ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان فقہا اور ان کے شاگرد آئمہ کے علاوہ جن کو لوگ صوفیا میں شمار کرتے ہیں وہ سب کے سب اپنے دور کے مفتی' عالم اور فقہی بھی تھے۔ جیسا کہ پہلے ابواب میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہ حضرات حسن بصریؒ - سعیدؒ بن المسیبؒ' حرمؒ بن حیان' مالکؒ بن دینار' معروف کرخیؒ' جنید بغدادیؒ اور ابوبکر شبلیؒ یہ سب مفسر' محدث اور فقیہہ تھے۔

مشہور تابعی حضرت اویس قرنیؓ نے حضرت علی المرتضیٰؓ سے فیض طریقت حاصل کیا۔

اور ان سے بھی اویسی سلسلہ طریقت آگے چلا۔
مثلاً ------ شیخ ابراہیم بن ادھمؒ عن شیخ موسیٰ بن یزید داعیؒ عن خواجہ اویس قرنیؓ۔ اسی طرح ----- حضرت امام ابوحنیفہؒ عن شیخ ہرم بن حیانؒ عن خواجہ اویس قرنیؓ۔
(تاریخ تصوف از عبدالصمد صارم)

پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں تصوف

ان دو صدیوں میں چند ایسی شخصیات منصہ کائنات پر جلوہ افروز ہوئیں جن کے علوم کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ انہوں نے ان تمام مبہم اور پیچیدہ نظریات کی تفسیر و تشریح کی جنہیں تصوف میں مختلف راستوں سے داخل کر کے بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں۔

ان دو صدیوں میں جن صوفیائے کرام نے اسلامی تصوف کی تبلیغ و ترویج فرمائی ان میں درج ذیل بہت مشہور ہیں۔

۱ حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ ۴۶۵ھ
۲ حضرت امام غزالیؒ ۵۰۵ھ
۳ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ۵۶۱ھ

شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ بہت بڑے عالم اور بلند پایہ صوفی تھے آپ نے شام، عراق، بغداد، فارس، قہستان، آذر بائیجان، طبرستان، خوزستان، کرمان، خراسان، ماوراء النہر اور ترکستان کا سفر کیا۔ اور افغانستان سے لاہور تشریف لائے۔ آپ پہلے بزرگ ہیں جن کی بدولت سرزمین پاک و ہند میں پہلی مرتبہ صحیح اسلامی تصوف نے رواج پایا۔ اس لیے تاریخ تصوف میں ان کی شخصیت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ آپ کی تصنیف کشف المحجوب اپنی منفرد نوعیت کے لحاظ سے ہر دور میں بے مثل رہی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ارشاد ہے۔

"اگر کسی راپیرے نباشد، چوں ایں کتاب را مطالعہ کند، اورا پید اشود۔ من ایں کتاب راہ تمام مطالعہ کردم۔" (فوائد الفواد)

"اگر کوئی ایسا شخص جس کا پیر نہ ہو، اس کتاب کا مطالعہ کرے گا تو یہ کتاب اس کو مرشد کا کام دے گی۔ میں نے اس کتاب کا پوری طرح مطالعہ کیا ہے۔"

آپ نے لاہور میں قیام فرمایا۔ اور اسلام کی تبلیغ کی۔ آپ کے ہاتھ پر لاہور کا ہندو راجہ مسلمان ہوا۔ اور آپ نے ہزاروں ہندوؤں کو مسلمان کیا۔ اسلامی تصوف کو رواج دیا اور اس کفرستان میں اسلامی شمع روشن کی۔ تصوف کے اندر جو غلط نظریات آ گئے تھے انہوں نے اپنی کتاب میں ان کی قرآن و سنت کے مطابق وضاحت کر کے رد کیا۔

آپ نے اپنی کتاب میں صوفی کی اصلیت، فقر، صحو و سکر، فنا و بقاء کشف و کرامت، وجد، صحبت شیخ اور سماع پر مفصل بحث کی ہے اور تصوف کو قرآن و سنت کے مطابق پیش کیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ "صوفی وہ ہے جو اپنے اخلاق و معاملات کو مہذب کر لے طبیعت کی آفتوں سے پاک صاف ہو۔ اور اس کا دل کدورت سے بھی پاک و صاف ہو۔" (کشف المحجوب (باب سوم)

سید ہجویر مخدوم امم
مرقد او پیر سنجر را حرم
خاک پنجاب از دم او زندہ گشت
صبح ما ازمہر او تابندہ گشت

(اقبالؒ)

پانچویں صدی ہجری کی دوسری بلند پایہ اور مشہور زمانہ شخصیت حضرت امام غزالیؒ کی ہے۔ آپ فلسفہ، علم کلام، فقہ و حدیث اور تصوف کے عالم تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ درس و تدریس تصنیف و مطالعہ، سیاحت، ریاضت و مجاہدہ اور تفکر و

تدبر میں گزرا۔ آپ نے یونانی فلسفے کے رد میں کتابیں لکھیں۔ اسلامی علوم و فنون اور حکمت و عمل پر احیاء العلوم جیسی عظیم اور لازوال کتاب تحریر کی۔ باطنیت و الحاد اور زندقہ پر ضرب کاری لگائی۔ تصوف کو حلول و اتحاد سے پاک کیا۔ آپ صحیح معنوں میں مجدد وقت تھے۔ وہ خود بہت بڑے صوفی تھے۔ ان کی کتابیں احیاء العلوم، کیمیائے سعادت اور رسالہ لدنیہ اس پر شاہد ہیں کہ انہوں نے علی وجہ البصیرت صحیح اسلامی تصوف کو نکھار کر تفصیل سے پیش کیا۔ آپ نے جس دور میں آنکھ کھولی اس میں شرعی مکلفات سے آزادی اختیار کرنے اور اسے "تصوف" کا رنگ دینے کی بہت سی کوششیں ہو رہی تھیں۔ صوفیہ کے اوراد و وظائف، تعلیمات و اعمال میں فرقہ باطنیہ اور اسماعیلیہ وغیرہ کے بہت سے ملحدانہ نظریات شامل کر دیئے گئے تھے۔ آپ نے ان نظریات کے ساتھ قلمی اور عملی جہاد کیا۔ انہوں نے کہا کہ معرفت الٰہی کا صرف وہی راستہ درست ہے جسے شریعت نے "احسان" کا نام دیا ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ ضلالت و کج روی اور ہلاکت و گمراہی ہے۔ نام نہاد صوفیوں، جاہل، ریاکار اور ملحد باطنیوں نے اہل سنت میں تصوف سے بے زاری کا رجحان پیدا کر دیا تھا۔

امام غزالیؒ نے اس بیزاری کو دور کیا۔ فقہ و تصوف کو ایک ثابت کیا۔ شریعت و طریقت میں جدائی ثابت کرنے کی جو کوششیں ہو رہی تھیں ان پر ضرب کاری لگائی۔ طریقت کو حقیقت شریعت اور سلوک کو مغز اعمال ثابت کیا۔ اگر آپ تجدیدی کارنامے سرانجام نہ دیتے تو حقیقت ہے کہ اسلامی تصوف، یونانی، رومی، عجمی اور ہندی دیومالائی تصورات میں گم ہو کر رہ جاتا۔ آپ نے یونانی فلسفہ پر بھرپور تنقید کی۔ اور اہل یورپ بھی آپ کی عظمت کے قائل ہو گئے۔ یورپ کے بڑے بڑے فلاسفہ اور مفکرین نے آپ کی عظمت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

چھٹی صدی ہجری کی عظیم المرتبت شخصیت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ہے۔ آپ صوفیا کے سرتاج اور صاحب کرامت ولی اللہ تھے۔ آپ سلسلہ عالیہ قادریہ کے بانی ہیں بغداد میں آپ نے اپنی خانقاہ قائم کی۔ اور تبلیغ اسلام کا کام شروع

کیا۔ آپ کے درس میں ہزاروں کی تعداد میں طالبان شریعت و طریقت موجود ہوتے تھے۔ آپ نے بدعات کا رد فرمایا اور سنت کو زندہ کیا۔ تصوف کے اندر جو غیر شرعی نظریات داخل کئے جا رہے تھے ان کو ایک ایک کرکے باہر نکالا۔ توحید خالص کا درس دیا۔ آپ کی بے مثل تصانیف فتوح الغیب اور غنیتہ الطالبین انہی امور پر مشتمل ہیں۔ جن میں شریعت و طریقت اور راہ سلوک کو اس کی اصلی اور حقیقی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ نے لوگوں کو رجوع الی اللہ کی دعوت دی۔ آپ شعلہ بیان مبلغ، کلمہ حق کہنے والے مجاہد، بارعب اور جلالی شخصیت کے مالک تھے۔ حاکم وقت کو اکثر نصیحت فرماتے اور رعایا کا خیال رکھنے کا حکم دیتے آپ لوگوں کو شریعت پر سختی سے کاربند ہونے اور امور دین کے ادا کرنے میں پوری احتیاط سے کام لینے کی تاکید فرماتے۔ آپ نے اپنے دور میں نظریہ حلول اور تنزیل وغیرہ کی سختی سے تردید کی اور تمام صوفیانہ مسائل کی اساس قرآن و سنت کو قرار دیا۔ سلسلہ قادریہ نے آپ کے بعد بہت ترقی کی اور اس کا فیض دور دور تک پھیل گیا۔

متاخرین صوفیہ کا دور

اس دور میں ہم نے ان بلند پایہ شخصیات کو منتخب کیا ہے۔ جن کا مقام صوفیاء عظام میں سب سے بڑھ کر ہے۔ اور انہوں نے تصوف کی تعلیم کو عام کرنے اور اس کی اصلاح کرنے میں عظیم کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ اسلامی تصوف کے تشخص کو واضح کرنے اور اس کے مقام کو بلند رکھنے میں ان حضرات کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس دور کے اکثر صوفیاء کرام کا تعلق برصغیر پاک و ہند سے ہے۔ اس خطہ ارض پر بدھ مت اور ہندومت نے اسلامی تصوف پر جو خطرناک حملے کئے اللہ کے ان پراسرار بندوں نے ان حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسلام کے نام کو ہمیشہ بلند رکھا ہزار ہا ہندوؤں کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔ یہ ان بزرگوں کے مساعی جمیلہ کا اثر ہے کہ آج اس خطہ پر کروڑوں مسلمان آباد ہیں۔ اس کی داغ بیل سید علی ہجویریؒ نے ڈالی اور اس کا سہرا بجا طور پر آپ کے سر ہے۔ حضرت علیؒ ہجویری

کے لگائے ہوئے پودے کو جن ہستیوں نے پروان چڑھا کر ایک تن آور درخت بنایا ان میں اہم ترین شخصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱	سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ	م (۶۳۳ھ)
۲	حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ	م (۶۳۳ھ)
۳	ابو حفص عمر بن محمد بن عبداللہ سہروردیؒ	م (۶۳۸ھ)
۴	حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ	م (۶۴۲ھ)
۵	حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ	م (۶۶۴ھ)
۶	حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ	م (۶۶۶ھ)
۷	حضرت جلال الدین رومیؒ	م (۶۷۲ھ)
۸	حضرت شاہ بہاؤ الدین نقشبند بخاریؒ	م (۷۱۷ھ)
۹	حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ	م (۷۲۵ھ)
۱۰	حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندیؒ	م (۱۰۱۱ھ)

یہ اولیائے کرام علم و عمل اور پابندی شرع میں بہت ممتاز تھے۔ تبلیغ و ترویج اسلام ان کی زندگی کا اولین مقصد تھا۔ انہوں نے اس دور کی بدعات کو دور کیا۔ اور تصوف پر غیر شرعی اثرات کو اپنی روحانی اور اخلاقی قوتوں سے زائل کیا۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے سلاسل تصوف چار سلسلوں قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ میں مدغم ہوگئے۔ جن کی نسبت بالترتیب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ معین الدین اجمیریؒ، شاہ بہاؤ الدین نقشبند بخاریؒ اور حضرت شہاب الدین عمر بن محمد سہروردیؒ سے ہے۔ یہ دور خاص طور پر برصغیر پاک و ہند اور سمرقند بخارا میں تصوف کے عروج کا دور تھا۔ اس دور میں اسلامی تشخص خاص طور پر ہندو مذہب کے مقابلے میں بہت نمایاں ہوا۔ اس زمانے میں "سماع" کا بھی رواج ہوا۔ اور تصوف میں چشتیہ سلسلے نے سماع کو اہم مقام دیا۔ سماع کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے خصوصی طور پر بہت اہمیت دی۔ لیکن اس دور کے

سماع اور آج کے سماع میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ صوفیائے چشتؒ نے جس سماع کو رواج دیا تھا وہ بغیر مزامیر اور تالی کے تھا۔ اس سماع میں کسی قسم کا ساز نہیں ہوا کرتا تھا۔ دف کا ذکر ملتا ہے۔ مختلف اوقات میں جس کا بجانا شریعت میں جائز ہے۔ ایسا سماع درحقیقت اشعار میں اللہ کی حمد وثنا اور نعت رسول مقبول ﷺ کا قوالی کی شکل میں بیان تھا۔

ان حضرات نے سماع کے لیے بہت سی شرائط عائد کی تھیں۔ مزامیر اور تالی بجانے کے بارے میں قرآن و حدیث میں بہت مذمت آئی ہے۔ مزامیر کو قرآن میں لہو الحدیث (سرود و اشعار) کا نام دیا گیا ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی شریف میں حدیث ہے۔ کہ حضورؐ نے فرمایا۔ "میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو زنا کرنے، شراب پینے، ریشم پہننے اور باجا بجانے کو حلال سمجھیں گے۔" مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ نے مجھے مزامیر توڑنے کا حکم دیا ہے۔"

حضرت سلطان المشائخؒ نے فرمایا:

"آں بہ لہوی مانند تا ایں غائیت از ملاہی و امثال آں احتراز آمدہ است پس در سماع بطریق اولیٰ کہ ازیں بابت باشد یعنی در منع دستک چندیں احتیاط آمدہ است پس در منع مزامیر بطریق اولیٰ۔"

"وہ لہو لعب میں شمار ہے۔ اس طرح کی جو بھی چیزیں ہیں ان سے احتراز کرنے کا حکم آیا ہے۔ اور سماع میں تو بطریق اولیٰ ممانعت ہے۔ یعنی تالی بجانے کی ممانعت کی مزید احتیاط آئی ہے۔ پس مزامیر کی تو اس سے بھی زیادہ ممانعت آئی ہے۔"

(فوائد الفواد)

حضرت نظام الدین اولیاء نے فرمایا۔ "من منع کردہ ام کہ مزامیر و محرمات درمیان نہ باشد"

"میں نے منع کر دیا ہے کہ (دوران قوالی و سماع) مزامیر اور (دیگر) محرمات درمیان میں نہ ہوں۔"

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے فرمایا۔ "سلطان المشائخ کہ مشغول بسماع بودی فرمودند کہ ہر کہ مزامیر بشنود در محفل من نہ آید۔" (ملفوظات سلطان المشائخ)

"سلطان المشائخ جو سماع میں مشغول تھے فرماتے ہیں۔ کہ جو بھی مزامیر سنتا ہے وہ میری محفل میں نہ آئے۔"

پس اس دور کے سماع میں کوئی غیر شرعی بات نہ ہوتی تھی۔ البتہ بعد میں "سماع" کے اندر تبدیلیاں آتی گئیں ہندو تہذیب و ثقافت کے مضر اثرات داخل ہونا شروع ہوگئے۔ اور اس میں آلات موسیقی داخل کر دیئے گئے۔ یعنی مباح میں مکروہات کو داخل کر دیا گیا۔

خواجگان چشتؒ صاحب تصانیف بھی تھے۔ جن میں دلیل العارفین، فوائد الفواد اور اسرار الاولیاء بہت مشہور ہیں۔ یہ تصوف اور اولیاء کرام کے حالات پر مشتمل ہیں۔ اور اس دور کی مکمل تاریخ کی عکاس بھی ہیں۔ اس دور میں حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی شخصیت بھی خاص اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی تصنیف "عوارف المعارف" کا مقام کتب تصوف میں بہت اونچا ہے۔

حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ فقہ و حدیث اصول و فروع میں کمال دسترس رکھتے تھے۔ آپ صاحب کرامت ولی اللہ تھے۔ آپ نے ملتان میں طالبان حق کی راہنمائی فرمائی۔ کثیر تعداد میں عوام الناس آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ آپ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے باکمال خلیفہ تھے۔

حضرت جلال الدین رومیؒ تاریخ تصوف میں بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔ مثنوی مولانا روم ایک عظیم کتاب ہے۔ علامہ اقبالؒ ان کی اس مثنوی سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ آپؒ نے سب سے پہلے اپنے والد شیخ بہاؤ الدینؒ پھر سید برہان الدین محقق ترمذی سے فیض حاصل کیا۔ اور اس کے بعد آپ کو حضرت شمس تبریزیؒ کی صحبت نصیب ہوئی۔ آپ نے تصوف میں "وحدت الوجود" کو اعتدال کی شکل میں

پیش کیا۔ گو آپ ابن عربیؒ سے متاثر تھے۔ لیکن اس مسئلے میں آپ نے اس شدت کو اعتدال کی صورت دی۔ اس کے علاوہ آپ نے اپنی مثنوی میں خودی، عشق، عقل اور انسان کامل کو موضوع سخن بنایا۔ مولانا رومؒ کی اور بھی کتب ہیں لیکن جو شہرت دوام مثنوی کو حاصل ہوئی وہ اور کسی کو نہ ہوئی۔ اس میں انہوں نے حیات انسانی کے اہم مسائل پر اس قدر مدلل بحث کی ہے کہ تمام دنیا اس سے متاثر ہوئی۔ تصوف کے موضوع پر اشعار میں یہ کتاب بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

اس دور کے صوفیائے عظام میں حضرت شاہ بہاؤ الدین نقشبندیہ بخاریؒ کی شخصیت بھی محتاج تعارف نہیں۔ آپ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے بانی ہیں۔ آپ خواجگان نقشبند کے سرخیل ہیں۔ حضرت خواجہ بابا محمد سماسیؒ نے آپ کو اپنی فرزندی میں قبول کیا۔ حضرت سید میر کلالؒ سے آپ کو بیعت کا شرف حاصل ہوا۔ شریعت مطاہرہ کی پابندی آپ کا شعار تھا۔ آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کے طریقے کی اساس کس چیز پر ہے! تو آپ نے فرمایا۔ "ظاہر میں خلق خدا پر اور باطن میں حق تعالیٰ پر۔" (سفینتہ الاولیاء)

آپؒ سے جب سماع کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا۔ "نہ انکار می کنم نہ ایں کار می کنم۔" یعنی نہ میں انکار کرتا ہوں اور نہ یہ کام کرتا ہوں۔" (سفینتہ الاولیاء)

آپؒ نے "اللہ" کے نقش کو لوگوں کے قلوب پر بند کر دیا۔ اور جو بھی آپ کے سلسلے میں داخل ہوا نقشبندی بن گیا۔ آپ کے خلفاء میں حضرت خواجہ محمد پارساؒ، حضرت علاؤ الدین عطارؒ اور حضرت یعقوب چرخیؒ بہت مشہور ہوئے۔

آپ کے سلسلہ کے بزرگوں میں سے حضرت خواجہ عبیداللہ احرارؒ بھی بہت مشہور ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ بھی آپ کے عقیدت مندوں میں تھے۔

ہندوستان میں عہد اکبری میں علماء اور صلحاء کی کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن حضرت خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہ العزیز کا وجود مسعود نعمت الٰہی تھا۔ آپ پہلے

لاہور میں قیام پذیر ہوئے پھر دہلی تشریف لے گئے۔ یہاں آپ کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی جیسی ہستیاں آپ کے حلقہ عقیدت میں داخل ہوئیں۔ آپ نے جوانی ہی میں وصال فرمایا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف چالیس برس کی تھی۔ آپ سے فیض حاصل کرنے کے لیے لوگ دور دور سے کھچے چلے آئے۔ آپ کے تمام مریدین آپ کے وصال کے بعد حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ آپ نے ہندوستان میں نقشبندیہ سلسلے کی بنیاد مستحکم طریقے سے رکھی۔ خوش قسمتی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حضرت مجدد الف ثانی جیسا مرید عطا فرمایا۔ ان کے علاوہ آپ نے دوسرے کئی ایسے بزرگوں کو بھی متاثر کیا جن کے ذریعے سے نہ صرف اس سلسلے کی بقا کا سامان ہوا بلکہ ملک ہندوستان میں اسلام کو تقویت ملی۔ اور جو پراگندگی اکبری بے اعتدالیوں کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی اس کا ازالہ ہوا۔

حضرت خواجہؒ جب ہندوستان میں آئے تو اکبری بدعتوں نے اگرچہ عام مسلمانوں کو ابھی متاثر نہیں کیا تھا لیکن درباری اور اونچے طبقوں میں خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اس لیے اس طبقے کو اسلام کے قریب لانے کی بڑی ضرورت تھی۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے اس طرف خاص دھیان دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی کوششوں میں بڑی برکت دی۔ آپ کا اثر و رسوخ اکبر کے دربار تک جا پہنچا اور اکبر بھی آپ کی تعلیمات سے متاثر ہونے لگا تھا۔ بلکہ ایک شہادت یہ بھی ملتی ہے کہ "اکبر بادشاہ خواجہ باقی باللہؒ کا مرید ہو گیا تھا۔ لیکن ہندو آنہ اثرات کو اپنے سے دور نہ کر سکا۔"

(خطبات عبید اللہ سندھی)

آپ غیر معمولی فہم و فراست کے مالک تھے۔ آپ تزکیہ نفس اور روحانی پاکیزگی پر بہت زور دیتے تھے۔ آپ کی طبیعت میں نرمی اور انکسار تھا۔ آپ کی دعوت تبلیغ خفیہ مگر مسلسل تھی۔ آپ نے تین چار سال کے قلیل عرصے میں جس سرعت کے ساتھ نقشبندیہ سلسلے کی بنیادیں مستحکم کیں۔ وہی آپ کی روحانی عظمت کا بین

ثبوت ہے۔ آپ نے ہندوستان میں اسلامی تصوف کو مضبوط بنایا اور بدعات کو دور کر کے آپ نے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کی جو ابتداء کر دی تھی اس کو تکمیل تک پہنچانے کی سعادت امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حصے میں آئی۔

تصوف اور حضرت مجدد الف ثانیؒ م (۱۰۳۴ھ)

حضرت مجدد الف ثانیؒ ۱۴۔ شوال ۹۷۱ھ یعنی ۲۶ جون ۱۵۶۴ء کو بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ آپ کا اسم گرامی "احمد" تھا۔ لقب بدرالدین اور کنیت ابوالبرکات تھی۔ آپ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد سے تھے۔ اس لیے فاروقی کہلائے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مخدوم عبدالاحدؒ اور سرہند کے دوسرے علماء سے حاصل کی۔ حدیث میں آپ کے سب سے مشہور استاد شیخ یعقوبؒ صرفی کشمیری تھے۔ کتب تصوف میں آپ نے ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم اور شیخ شہاب الدینؒ سہروردی کی کتاب عوارف المعارف کا مطالعہ کیا۔ آپ کی اکثر صلاحیتیں خداداد تھیں اور ان کے جوہر نقشبندیہ سلسلے میں بیعت اور حضرت باقی باللہؒ کی خدمت میں پہنچنے کے بعد کھلے۔ آپ پہلے ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کے قائل تھے مگر بعد میں آپ نے اس کے مقابلے میں نظریہ وحدت الشہود پیش کیا۔ جب آپ علوم عقلیہ اور نقلیہ سے استفادہ کر چکے تو آپ نے سرہند شریف میں درس علوم اور تبلیغ و ترویج اسلام کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ نے کچھ عرصہ اکبر آباد میں بھی قیام فرمایا۔ اور اس دوران میں آپ کو ابوالفضل اور فیضی سے کئی بار ملنے کا موقع ملا۔ یہ دونوں بھائی آپ کے علم و فضل کے بڑے معترف تھے۔

حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی خدمت میں آپؒ ربیع الثانی ۱۰۰۸ھ کے وسط میں حاضر ہوئے۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی توجہ سے اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور استعداد عالی کی بدولت آپ نے طریقت کی بہت سی منزلیں تھوڑے ہی عرصہ میں طے کر لیں۔ آپ کی علمی قابلیت، روحانی عروج اور بلند حوصلگی نے خواجہؒ صاحب کو قائل کر لیا۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے اپنے خطوط میں آپ کا ذکر بڑے احترام سے

کیا ہے۔ ایک خط میں آپ لکھتے ہیں۔

"شیخ احمد نام مردیست از سرہند، کثیر العلم وقوی العمل، روزے چند فقیر با او نشست و برخاست کرد۔ عجائب بسیار از روزگار اوقات او مشاہدہ نمود۔ بآں ماند کہ چراغے شود کہ عالمہا ازو روشن گردد۔" (زبدۃ المقامات۔ از مولانا ہاشم کشمیؒ)

"شیخ احمد سرہند کے رہنے والے ایک صاحب ہیں۔ جن کا علم کثیر اور عمل قوی ہے۔ اس فقیر نے کچھ روز ان کے ساتھ گزارے ہیں۔ ان کی صحبت میں بہت سی عجیب و غریب چیزوں کا مشاہدہ ہوا۔ وہ ایسی ہستی ہیں جن کے چراغ کی روشنی سے کئی جہان منور ہوسکتے ہیں۔"

حضرت خواجہ باقی باللہؒ کا وصال ۱۰۱۱ھ میں ہوا۔ اور اس کے تقریباً دو سال بعد شہنشاہ اکبر بھی مر گیا۔ اور اس کی جگہ جہانگیر تخت نشین ہوا۔ اس وقت حضرت مجدد الف ثانیؒ کی عمر شریف بیالیس سال تھی۔ حضرت خواجہ باقی باللہ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ ہم عمر تھے۔ دونوں کا سن پیدائش ۹۷۱ھ ہے۔ لیکن حضرت خواجہؒ کا چالیس سال کی عمر میں ہی وصال ہوگیا۔ اور آپ کے مشن کو سرکار مجددؒ نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ کیونکہ قدرت کو یہی منظور تھا کہ تجدید دین کا کام شیخ احمد سرہندی فاروقیؒ کے ہاتھوں انجام پائے۔

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ جب منصب ولایت پر فائز ہوئے تو آپ نے اپنی حیات طیبہ شریعت محمدیؐ کی ترویج کے لیے وقف کردی اور یہی مقصد آپ کی دعوت تجدید کا بنیادی رکن تھا۔ آپ نے ترویج شریعت، احترام سنت، رد بدعت اور اصلاح تصوف کے لیے بے حد کامیاب کوششیں کیں۔ اکبر بادشاہ اور اس کے ملحد امراء کے کفریہ عقاید کی وجہ سے دین مبین پر جو مصائب نازل ہو رہے تھے۔ اور دین اسلام کو جن جن طریقوں سے ہندو دھرم میں تبدیل کیا جا رہا تھا اگر سرکار مجددؒ اس کا دفاع نہ کرتے تو آج برصغیر میں اسلام کی صورت بہت مختلف ہوتی۔ اور یہ عین حقیقت ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں حضرت علی ہجویریؒ سے لے کر حضرت

باقی باللہؒ تک جتنے بھی کثیر تعداد میں صوفیا کرام تشریف لائے اور اسلام کی تبلیغ کے لیے جو کوششیں کیں انہیں کمزور کر دیا گیا تھا۔ اور تصوف کا وہ پودا جس کو حضرت علی ہجویریؒ نے پنجاب میں بویا تھا۔ اور خواجہ اجمیریؒ اور ان کے خلفاء نے پروان چڑھایا تھا' سوکھ رہا تھا آپ نے اس کی آبیاری کی آپ ہی کی مساعی جمیلہ کی بدولت اکبر کا نام نہاد "دین الٰہی" اور ملحدانہ نظریات مٹ گئے۔ آپ نے بڑی حکمت عملی اور ذہانت و فراست سے تبلیغی کام کو جاری کیا۔ قلمی ' جسمانی اور روحانی جہاد کیا۔ امراء علماء اور صوفیاء کو متوجہ فرمایا۔ اکبر اور جہانگیر کی حکومت کی پروانہ کرتے ہوئے ہند میں سرمایہ ملت کی نگہبانی فرمائی۔ اپنے مجددانہ انداز میں جادہ شریعت سے ہٹے ہوئے غلط صوفیاء کی غلط روش اور ناپسندیدہ افعال پر تنقید کی۔ علماء سوء کی جاہ پسندی سے اسلام کو جو نقصان ہو رہا تھا اس پر تاسف کا اظہار فرمایا' بدعت کو دور کر کے سنت کو زندہ فرمایا۔ عرضیکہ وہ تمام امور جو شریعت حقہ کو مٹا رہے تھے ان کا قلع قمع کر کے دین کو نئے سرے سے تقویت بخشی اور اس طرح آپ "مجدد الف ثانی" کے خطاب سے نوازے گئے۔

اکبر کی پالیسی یہ تھی کہ اپنی حکومت کو تمام جائز و ناجائز طریقوں سے مستحکم کیا جائے۔ وہ خود ان پڑھ تھا۔ اس کے مشیر بڑے ذہین تھے۔ جن میں ہندو بھی تھے۔ جو مشیر مسلمان تھے وہ ہندو اثرات کی زد میں تھے۔ ان لوگوں نے اکبر کو اسلام سے برگشتہ کیا۔ متکبر بنایا۔ اور اس دور کے علماء سوء نے تعظیمی سجدے کو بادشاہ کے لیے روا اور جائز قرار دیا۔ مشیروں کے مشورے سے اس نے ایک نئے دین کی بنیاد رکھی جس کا نام "دین الٰہی" رکھا گیا۔ اس میں اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا گیا اور ہندو تہذیب و ثقافت کی بھرپور حوصلہ افزائی کی گئی۔ کلمہ حق کہنے والے علماء کو سرعام قتل کرایا گیا۔ اکبر نے ہندو عورتوں سے شادیاں کیں۔ مساجد کو تالے لگا دیئے گئے۔ اذان پر پابندی لگا دی گئی۔ قربانی کو ناجائز قرار دیا گیا۔ مندروں کو کھول دیا گیا۔ ہندوؤں کو مساجد کے سامنے باجا بجانے کی اجازت دے دی گئی۔ ختنہ کرانے اور اپنے نام کے

ساتھ "محمد" کا لفظ لگانے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ ہندوؤں پر جزیہ معاف کر دیا گیا۔ بظاہر ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت تھی لیکن حقیقت میں حکومت کا نظام ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھا۔ سارے ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ مسلمانوں کی مذہبی آزادی ختم ہو چکی تھی۔ اکبر نے کہا رام اور رحیم حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ اس طرح اسلام اور ہندو مت کو ملانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی گئی۔۔۔ ایسے حالات میں شیخ احمد سرہندیؒ کے فاروقی خون نے جوش مارا۔ اور آپ مجاہدانہ وقار لیئے ہوئے اکبر کے کافرانہ نظریات کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان عمل میں تشریف لائے۔ اور تن تنہا اس کٹھن اور مشکل کام کا بیڑا اٹھایا۔ ابو الکلام آزاد لکھتے ہیں۔

"شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہد جہانگیری کے اوائل میں کیا ہندوستان علماء و مشائخ حق سے بالکل خالی ہو گیا تھا؟ کیسے کیسے اکابر موجود تھے لیکن مفاسد وقت کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود گرامی ہی تن تنہا اس کاروبار کا کفیل ہوا۔"

(تذکرہ ابو الکلام آزاد)

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

(اقبالؒ)

اکبر کی موت کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا۔ اس وقت تحریک مجدد شروع ہو چکی تھی۔ آپ نے علماء' صوفیاء امراء اور فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز مسلمانوں کو خطوط لکھے اور حالات کی سنگینی سے آگاہ فرمایا آپ کے مریدین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ اور شاہی فوج میں بھی کثیر تعداد میں آپ کے مریدین چھا گئے۔ جہانگیر کو خبر ملی تو اسے خدشہ ہوا کہ اگر اسی طرح ان کے مریدوں کی تعداد بڑھتی گئی تو ایک دن یہ حکومت کا تختہ الٹ دیں گے۔ اس نے حضرت مجدد کو اپنے

دربار میں مدعو کیا۔ آپؒ نے وہاں سجدہ تعظیمی نہ کیا اور نہ ہی درباری آداب کو ملحوظ رکھا جس سے جہانگیر ناراض ہوا اور آپ کو قلعہ گوالیار میں نظر بند کر دیا گیا۔ آپ تقریباً ایک سال اس قلعہ میں بند رہے۔ قلعہ کے اندر جتنے غیر مسلم تھے۔ وہ سب مسلمان ہو کر آپ کے حلقہ میں داخل ہو گئے جہانگیر کو جب اس کا علم ہوا تو وہ گھبرا گیا۔ اس نے فوراً آپ کو رہا کرنے کا حکم دیا اور کثیر تعداد میں قیمتی تحائف بھی نذر کئے۔ اور آپ کے کہنے پر تمام مشرکانہ اور ملحدانہ نظریات ختم کر دیئے اور اسلام پر جو حملے اکبری دور میں ہوئے تھے ان کو دور کیا جہانگیر بنفس نفیس حضرت مجدد الف ثانیؒ کے معتقدوں میں شامل ہو گیا۔ اور اسلامی شعائر پر جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں وہ ہٹا دی گئیں۔

نظام حکومت میں اصلاح کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں اسلامی تصوف پر جو ہندوانہ اثرات پڑ چکے تھے آپ نے ان کو بطریق احسن زائل کیا۔ ہندو سادھو اور نام نہاد درویش عوام الناس میں اس بات کا پرچار کر رہے تھے کہ رام اور رحیم ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ یہ بہت مہلک تصور تھا جو لوگوں کے ذہنوں میں بٹھایا جا رہا تھا۔ آپ نے اس مشرکانہ نظریے کی سخت تردید کی۔ اور لوگوں کو سمجھایا کہ رام اور چیز ہے اور رحیم اور۔ رحیم خالق حقیقی ہے اور رام مخلوق ہے۔ اس طرح ہندوستان میں دو قومی نظریہ سب سے پہلے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے پیش کیا۔ اور تحریک پاکستان میں جس دو قومی نظریے کا آغاز کیا گیا دراصل اس کا آغاز حضرت مجددؒ نے کر دیا تھا۔ اور آج مشہور یہ ہے کہ دو قومی نظریہ سب سے پہلے سرسید احمد خان نے پیش کیا تھا۔ آپ نے خبردار کیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دینا بہت بڑی جہالت ہے۔

آپ نے ہند میں سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کو رواج دیا۔ اور آپ کے بعد یہ سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کہلانے لگا۔ آپ نے شریعت کو طریقت حقیقت اور معرفت کی بنیاد قرار دیا۔ اور فرمایا کہ شریعت ہی اصل ہے۔ اس کے بغیر نہ طریقت کی راہ اختیار

کی جا سکتی ہے۔ نہ حقیقت تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی معرفت الٰہی کا حصول ہو سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"تمام سعادتوں کا سرمایہ سنت کی متابعت ہے۔ اور تمام فسادوں کی جڑ شریعت کی مخالفت ہے ہنود نے بہت ریاضتیں اور سخت مجاہدے کئے لیکن شریعت کے موافق نہ ہونے کیوجہ سے سب بے اعتبار اور خوار ہیں۔" (مکتوبات دفتر اول - مکتوب ۱۱۴ بنام صوفی قربان از حضرت مجدد الف ثانیؒ)

اکثر لوگ شریعت کو پوست اور حقیقت کو مغز خیال کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ بعض صوفیوں کی سکر و مستی میں نکلی ہوئی باتوں کے دھوکہ میں آچکے ہیں اور احوال و مقامات سے فتنہ میں پڑ چکے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کا طریقہ صراط مستقیم ہے۔ اس کے سوا باقی سب راستے ٹیڑھے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"اِنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ"

"بے شک یہی میرا سیدھا راستہ ہے۔ تو اسی کی پیروی کرو۔ اس کے علاوہ دوسرے مختلف راستے اختیار نہ کرو"

سب ہدائتوں سے بہتر نبی کریم ﷺ کی ہدایت ہے:

"خَیْرُ الْهَدْیِ هَدْیُ مُحَمَّدٍ" بہترین سیرت محمد (ﷺ) کی سیرت ہے۔"

(مکتوبات دفتر اول - مکتوب ۴۰ بنام شیخ محمد)

مزید فرمایا "کل قیامت کے دن صاحب شریعت علیہ الصلوۃ واسلام کی متابعت ہی کام آئے گی۔ احوال و مواجید، علوم و معارف، اشارات و رموز اس متابعت کے ساتھ میسر ہو جائیں تو بہتر اور زہے نصیب۔ ورنہ استدراج اور خرابی کے سوا ان میں کچھ نہیں۔" (مکتوبات دفتر اول - بنام قلیج اللہ)

اس طرح آپ نے تصوف کے ساتھ منسوب غلط قسم کے خیالات کو ختم کیا۔ اور لوگوں کے ذہنوں پر یہ جو تصور بیٹھ گیا تھا کہ تصوف شریعت سے علیحدہ ایک

منزل ہے اور یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ آپ نے اس تصور کو دور کیا۔ اور فرمایا کہ۔ "تصوف شعار حقہ اسلامیہ میں خلوص پیدا کرنے کا نام ہے۔"

آپ نے تصوف میں بدعتوں کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔ اور تصوف کے رخ تاباں پر بدعات کی جو گرد جم چکی تھی اسے صاف کیا۔ اور تصوف کو اس کی اپنی اصلی شکل میں پیش کیا۔

شرع کی ترویج، شریعت و طریقت کی تطبیق، تصوف کی اصلیت اور بدعات کی مخالفت کے علاوہ شیخ مجدد نے جو اہم کام کیا وہ اسلام کا عام احیاء تھا۔ ایک طرف اکبر کی ہندو نواز پالیسی نے اور دوسری طرف ہندو احیائیت نے مسلمانوں کے لیے طرح طرح کی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ آپ نے شعائر اسلام کے احترام پر زور دیا۔ امراء اور اراکین سلطنت کو اس کی تلقین کی۔ خود اپنی زندگی میں اسلامی نقطہ نظر کے احترام کی بڑی قابل قدر اور جراتمندانہ مثال قائم کی۔ آپ نے جہانگیر جیسے خود مختار اور مطلق العنان بادشاہ کے سامنے سجدہ نہ کر کے قید و بند کی سختیاں برداشت کیں اور کمال جرات و دلیری اور احترام دین سے خلاف شرع احکام کی عملی مخالفت کی۔ آپ نے اس وقت کے علماء، صوفیا اور نام نہاد مفتیوں کو جھنجوڑا جو دبے بیٹھے تھے۔ اس سے ہندوستان میں جو اسلام پسند گروہ تھا اسے بہت تقویت ملی۔ اس طرح سارے ہندوستان میں غیر شرعی حکومت وقت کے خلاف تن تنہا حضرت مجدد الف ثانی علیہ رحمتہ کی حق گوئی و بے باکی نے حکومت وقت کو ہلا کر رکھ دیا۔ اور جو غیر اسلامی رسومات، بدعات اور احکامات رائج تھے ان کا ازالہ ہوا۔ اور شعائر اسلامی کے احترام کا پھر سے خیال کیا جانے لگا۔ جہانگیر نے وہ تمام غیر اسلامی احکامات واپس لے لیے جو اس کے والد اکبر نے جاری کئے تھے۔ اس طرح آپ کی مجددانہ کوششوں سے ایسا مئوثر اسلامی نظام قائم ہوا جس سے آپ کے مقاصد کی تکمیل ہوئی۔ آپ کے بے شمار خلفاء تھے۔ جو ہندوستان کے کونے کونے میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی تبلیغ و ترویج اسلام کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ آپ کے بعد آپ کے

صاحبزادگان نے آپ کا کام جاری رکھا۔ اور آج بھی آپ کے سلسلے کا فیض جاری ہے۔

"سب سے بڑا جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔ شیخ مجددؒ اس حدیث کی عملی مثال تھے۔ آپ نے بیک وقت دو جابر حکمرانوں کا مقابلہ کیا اور ہندوؤں اور گمراہ فرقوں کی مخالفت بھی مول لی۔ لیکن حق بات نہ صرف بیان کی بلکہ اس پر عملدرآمد بھی کرایا۔ اور ان مہلک اور خطرناک غیر اسلامی نظریات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جو اسلام کے درخشندہ آفتاب پر گھنگھور گھٹا بن کر چھا گئے تھے۔ یہ کوئی معمولی کام نہ تھا۔ دین کی تجدید کا کٹھن کام آپ ہی کے ہاتھوں مکمل ہوا۔ اور ملت اسلامیہ نے آپ کو مجدد الف ثانی کے لقب سے یاد کیا۔

زمانہ آپ کی خوبیوں' صلاحیتوں اور قابلیتوں کا معترف ہوا۔ مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ جب سرہند شریف میں آپ کی قبر اقدس پر حاضر ہوئے تو بے حد متاثر ہوئے۔ اپنے تاثرات کو اشعار کا رنگ دیا تو لکھا۔

حاضر ہوا میں شیخ مجددؒ کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی شخصیت جامع صفات تھی۔ ان کی طرز تحریر میں قوس قزح کے سارے رنگ ہیں۔ کہیں زور خطابت ہے۔ کہیں متکلمانہ موشگافی اور کہیں علمی متانت ہے۔ اور ان سب میں اعلیٰ درجے کی فصاحت و بلاغت۔ آپ کے تحریری مجموعوں میں جو مقبولیت مکتوبات شریف کو حاصل ہوئی وہ شاید ہی کسی اور

کو حاصل ہوئی ہو۔" "مکتوبات امام ربانی" شیخ مجدد کی زندگی ہی میں مرتب ہو گئے تھے۔ ان کی تین جلدیں ہیں۔ دفتر اول جسے "درالمعرفت" بھی کہتے ہیں۔ ۳۱۳ خطوط پر مشتمل ہے۔ دفتر دوم جس کا تاریخی نام "نور الخلائق" ہے۔ اس میں مکتوبات کی تعداد ۹۹ ہے۔ لیکن یہ خطوط بڑے طویل اور مفصل ہیں۔ دفتر سوم "معرفت الحقائق" کے نام سے موسوم ہے۔ اس دفتر میں ۱۲۴ مکاتیب ہیں۔ آپ کے یہ تمام مکتوبات حقیقت و معرفت کے خزانے ہیں۔

ان کے علاوہ آپ نے بہت سے رسائل بھی تحریر کئے جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ شرح رباعیات ۲۔ اثبات النبوت ۳۔ رسالہ رد روافض ۴۔ رسالہ تہلیلیہ
۵۔ معارف لدینہ ۶۔ مبداء و معاد ۷۔ تعلیقات عوارف۔

آپ کے صاجزادگان میں خواجہ محمد صادقؒ سب سے بڑے تھے۔ جو عین جوانی میں بعارضہ طاعون وفات پاگئے۔ دوسرے صاجزادے حضرت خواجہ محمد سعیدؒ تھے۔ جو بہت بڑے عالم تھے' فقیہہ اور صوفی تھے۔ شاہجہان اور اورنگ زیب عالمگیرؒ ان کی بہت عزت و توقیر کرتے تھے۔ آپ کے تیسرے صاجزادے حضرت خواجہ محمد معصومؒ تھے۔ جو خواجہ محمد سعیدؒ کے وصال کے بعد سرہند شریف میں سجادہ نشین ہوئے۔ اور کاروبار ارشاد وہدایت کے تنہا ذمہ دار تھے۔ ان کا لقب عروۃ الوثقی تھا اور قیوم ثانی کے نام سے بھی یاد کئے جاتے تھے۔ شجرہ طریقت میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد آپ ہی کا نام نامی آتا ہے۔ شہنشاہ ہند حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ آپ کے مرید تھے۔ خواجہ محمد معصومؒ کے جانشین خواجہ محمد نقشبندؒ تھے۔ جنہیں قیوم ثالث کہا جاتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمہ ان کے بے حد معتقد تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے دو اور صاجزادے محمد فرخؒ اور محمد عیسیٰؒ بھی تھے۔ جو کم عمری ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ ایک صاجزادی ام کلثومؒ بھی تھیں۔

آپ کے دیگر خلفاء میں حضرت شیخ آدم بنوریؒ بھی تھے۔ جن کا فیض بھی

دور دور تک پہنچا۔ افغانستان کے علاقے میں نقشبندیہ سلسلہ بہت مقبول ہوا اس کی وجہ خواجہ محمد معصومؒ اور شیخ آدم بنوریؒ کی مساعی جمیلہ تھی۔ شیخ آدم بنوریؒ کے خلفا میں سے لاہور کے شیخ سعدیؒ، کوہاٹ میں حاجی عبداللہ کوہاٹیؒ، پشاور میں شیخ نور محمد پشاوریؒ اور ایک بزرگ حافظ سید عبداللہ اکبر آبادیؒ تھے۔ جن کے مرید شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے والد شیخ عبدالرحیمؒ اور چچا شیخ محمد رضاؒ ہوئے۔ نقشبندیہ سلسلے میں خواجہ محمد زبیرؒ کو جنہیں قوم چہارم کہا جاتا ہے بہت شہرت حاصل ہوئی۔

امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ ۱۶۲۲ء میں اجمیر تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے حضرت خواجہ معین الدینؒ کے مزار کی زیارت کی۔ اور دیر تک مراقبہ کیا۔ اور فرمایا کہ بہت سی اسرار کی باتوں کا ذکر ہوا۔ اسی جگہ مزار کے خادموں نے حاضر ہو کر خواجہ اجمیریؒ کے مزار کا قبر پوش پیش کیا۔ جسے آپ نے قبول فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ چونکہ یہ لباس حضرت خواجہ سے بہت قریب رہا ہے۔ اس لیے اسے میرے کفن کے لیے سنبھال کر رکھا جائے۔ اس کے بعد آپ واپس سرہند تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے خلوت اختیار کرلی۔ اور فرمانے لگے کہ وقت قریب آچکا ہے۔ دوستوں کو بھی خطوط لکھ دیئے۔ اور بہت سی خیرات کی۔ کسی نے سمجھا کہ دفع بلیات کا صدقہ ہے تو آپ نے ہندی کا یہ مصرع پڑھ کر حقیقت حال واضح کی۔

اج ملاوا کنت سوں، سکھی، سب جگ دیواں وار

یعنی "آج وصال کا دن ہے اے سکھی! میں اس خوشی میں تمام دنیا کو نثار کر دوں"

آخر کار آفتاب مجدد تریسٹھ برس اس دنیائے فانی میں ضیاپاشی کرنے کے بعد ۲۸ صفر ۱۰۳۴ ہجری بمطابق ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء کو غروب ہوگیا۔ سرہند شریف میں مرقد مبارک مرجع ملائک و خلائق ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ کو جب نبوت ملی تو اس وقت آپؐ کی عمر شریف چالیس برس کی تھی۔ اور جب امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کو تجدید دین کا فریضہ سونپا گیا تو اس وقت شیخ مجدد کی عمر مبارک بھی چالیس سال تھی۔ یعنی چالیس سال کی

عمر میں حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کا وصال ہو گیا۔ اور شیخ مجدد مسند ارشاد و خلافت پر متمکن ہوئے۔

نبی کریم ﷺ نے نبوت کے اعلان کے بعد تیئس سال کے قلیل عرصے میں دین اسلام کی تبلیغ کا کام پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ بعینہ شیخ مجددؒ نے بھی صرف تیئس سال کی مدت میں تجدید دین کا کام سرانجام دیا۔ اس طرح رسول اکرم ﷺ کے ساتھ خاص نسبت رکھتے ہوئے شیخ مجدد نے بھی تریسٹھ سال کی عمر میں وصال فرمایا۔ ماشاء اللہ زہے نصیب!!

گیارھویں صدی ہجری سے تاحال

اس دور میں چند شخصیات ایسی ملتی ہیں جنہوں نے تصوف کی حقیقت کو برقرار رکھا۔ اور اس پر کسی غلط نظریے کو مسلط نہیں ہونے دیا۔ اس دور میں نقشبندیہ مجددیہ سلسلے نے بہت ترقی کی اور یہ سلسلہ بغیر کسی تغیر و تبدل کے جاری رہا۔ اس کے ساتھ سلسلہ قادریہ اور چشتیہ نے بھی ترقی کی۔ اور اس سلسلے سے منسلک صوفیا نے اپنے اپنے دور میں کافی کام کیا۔ اس دور کے صوفیاء میں سے درج ذیل ہستیاں بہت مشہور ہوئیں۔ اور انہوں نے ترویج تصوف کے لیے بے مثال کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

۱۔ حضرت خواجہ محمد معصومؒ نقشبندی مجددی
۲۔ حضرت خواجہ محمد نقشبندؒ نقشبندی مجددی
۳۔ حضرت خواجہ محمد زبیرؒ نقشبندی مجددی
۴۔ حضرت میاں محمد میر قادریؒ
۵۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ
۶۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ
۷۔ حضرت نور محمد مہاروی چشتیؒ
۸۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ

۹۔ حضرت مہر علی شاہ گولڑویؒ

۱۰۔ حضرت شیر محمد شرقپوریؒ

۱۱۔ حضرت پیر جماعت علی شاہؒ

۱۲۔ حضرت خواجہ قمرالدین چشتیؒ سیالوی

۱۳۔ حضرت فقیر محمد چوراہیؒ نقشبندی مجددی

۱۴۔ حضرت حافظ محمد عبدالکریم نقشبندیؒ مجددی

۱۵۔ حضرت خواجہ صوفی نواب الدین نقشبندی مجددیؒ

۱۶۔ حضرت خواجہ محمد معصوم نقشبندی مجددیؒ

ان کے علاوہ الجزائر میں امیر عبدالقادرؒ، غازی محمد نقشبندیؒ، حضرت محمد احمدؒ سوڈانی، سید احمد شریف السنوسیؒ، سید جمال الدین افغانیؒ اور ان کے دست راست شیخ محمد عبدہ۔ ان صوفیا کرام میں سے نقشبندی مجددی صوفیا نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرز اور انداز پر ہی تصوف کی تعلیم کو جاری رکھا۔ البتہ قادری اور چشتی حضرات نے اپنے سلاسل کو از سر نو منظم کیا اور ان سلاسل کو دوبارہ عام کیا۔ ان میں حضرت میاں میر قادری لاہوریؒ اور حضرت نور محمد مہاروی چشتیؒ زیادہ مشہور ہیں۔ حضرت میاں میر قادریؒ کو اپنے زمانے میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔

شاہجہان دوبار آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دارراشکوہ بھی آپ کا بہت گرویدہ تھا۔ لیکن جب بیعت کا ارادہ کیا تو آپ وفات پا چکے تھے۔ آپ کے دور میں قادریہ سلسلے کو بہت ترقی ملی۔ ہندوستان میں جہاں بہت سے صوفیائے کرام تشریف لائے وہاں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان نے بھی بہت شہرت پائی۔ آپ نے بھی نقشبندی سلسلے سے فیض حاصل کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث اور مجتہد بھی تھے۔ انہوں نے اپنے دور کی معاشرتی برائیوں کو دور کیا۔ جو بدعتیں پھیل چکی تھیں ان کی جگہ سنت کو زندہ کیا۔ تصوف کے مسئلے کو پھر ٹیڑھا کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں آپ نے انہیں نیست و نابود کیا۔ قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اور حجتہ

اللہ البالغہ کتاب لکھ کر ملت اسلامیہ پر احسان کیا۔ آپ کے مشن کو آپ کے صاحبزادوں خاص طور پر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے جاری رکھا۔

حضرت نور محمد مہاروی چشتیؒ نے پنجاب میں چشتیہ خاندان کو تقویت دی اور آپ کے فیض سے خواجہ سلیمان تونسویؒ اور پیر مہر علی شاہ صاحبؒ گولڑوی بہرہ ور ہوئے۔ ان کے ساتھ ہی نقشبندیہ سلسلے کے چشم و چراغ حضرت شیر محمد شرقپوریؒ پیر جماعت علی شاہؒ اور حضرت فقیر محمد چوراہیؒ نے بھی سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کو عروج دیا۔

راولپنڈی میں حضرت فقیر محمد رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز حضرت حافظ محمد عبدالکریمؒ نے بہت مقام پایا۔ اور اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ لیکن آپ کے خلفاء میں سے جو مقام حضرت خواجہ صوفی نواب الدین رحمۃ اللہ علیہ کو نصیب ہوا کسی اور کو نہ ملا۔ آپ نے موہری شریف ضلع گجرات میں خانقاہ تعمیر کروائی اور ذکر الٰہی کی ترویج اور قرآن و سنت کی تبلیغ کا کام ایک جامع انداز میں شروع کیا۔ آپ نے بڑے کٹھن حالات میں تصوف کے اس پودے کی آبیاری کی۔ اور اسے پروان چڑھایا۔ آپ صاحب تسلیم و رضا، پیکر جود و سخا اور مجسم زہد و روع تھے۔ آپ نے ذکر بالجہر کو رواج دیا۔ اور موہری شریف میں نقشبندیہ مجددیہ سلسلے کی بنیاد پختہ طریقے سے رکھی جس پر عالمی مبلغ اسلام حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی۔ حضرت خواجہ محمد معصوم صاحبؒ، حضرت صوفی نواب الدین علیہ الرحمتہ کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے۔

حضرت صوفی نواب الدینؒ کا وصال ۱۲۔ ربیع الاول ۱۳۸۵ھ بمطابق ۱۲ جولائی ۱۹۶۵ء بروز سوموار ہوا۔ آپ کے بعد حضرت خواجہ محمد معصوم صاحبؒ دربار عالیہ نقشبندیہ مجددیہ موہری شریف کے مسند نشین ہوئے۔ حضرت خواجہ محمد معصوم علیہ الرحمتہ کی ذات گرامی جامع صفات تھی۔ آپ نے دور جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے طریقت میں بہت سی اصلاحات جاری کیں۔ جن میں ذکر بالجہر کو خاص

اہمیت حاصل ہے۔ آپ نے موہری شریف کی چھوٹی سے بستی کو مرکز بنا کر ذکر الٰہی کی آواز کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچایا' آپ نے پے در پے یورپ' امریکہ' آسٹریلیا ایشیا اور شمالی افریقہ کے بڑے بڑے ممالک کے تبلیغی اور روحانی دورے کئے۔ ہر ملک میں اپنے روحانی مراکز قائم کئے۔ اور اللہ کی مخلوق کو ذکر الٰہی کے وجد آفریں نغمات سے سرشار کیا۔ بہت سے غیر مسلموں کو کلمہ پڑھایا۔ آپ کی اصلاحی اور تجدیدی کوششوں کی وجہ سے احیائے دین اسلام کو تقویت ملی۔ آپ نے خانقاہی نظام اور طریق کار کی بھی اصلاح فرمائی۔ صوفیاء اور علماء کو متحرک کیا۔ سجادہ نشینی کے جمود کو توڑا۔ ملکی اور غیر ملکی تبلیغی دورے کر کے مخلوقات کی اصلاح فرمائی۔ بدعات کو دور کیا سنت کو زندہ کر کے اسلام کا سہل اور آسان راستہ دکھایا۔ تصوف میں پیدا شدہ پیچیدگیوں کو عملی طور پر دور کر کے شریعت حقہ کے صاف ستھرے طریقوں کو اپنایا۔ آپ نے گوشہ نشینی' پر تکلف مجاہدوں اور قدیم رسموں کی حوصلہ شکنی کی۔ آپ نے فرمایا "ہمارا تصوف سنت نبوی کی سیدھی سادی تعلیم ہے۔ جس میں اعتدال پایا جاتا ہے۔"

آپ بلاشبہ اس دور کے بہت بڑے مصلح اور مبلغ تھے۔ آپ کی زندگی کے شب و روز جہاد اکبر میں گزرے۔ آپ میں توکل' تسلیم و رضا' صبر و استقلال اور زہد و تقویٰ ایسی صفات حمیدہ بدرجہ اتم موجود تھیں آپ پر وقار اور منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ جو بھی آپ کی زیارت کرتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ مجھے بھی آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آپ کا وصال ۳ نومبر ۱۹۹۳ بروز بدھ صبح کے وقت ہوا آپ موہری شریف میں اپنے والد اور مرشد حضرت صوفی نواب الدینؒ کے پہلو میں ایک مقبرے کے اندر دفن ہیں۔

باب ۴

تصوف کا عملی پہلو

گزشتہ صفحات میں تصوف کے تاریخی اور علمی پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں عہد بعہد اس کے تدریجی عمل کو سامنے رکھتے ہوئے ان برگزیدہ ہستیوں کا بھی مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔ جنہوں نے عملی طور پر اس مسلک کی تکمیل کی اور اس کی تبلیغ و ترویج کے لیے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ نیز انہوں نے تصوف کے نظریات کو علمی حیثیت سے پیش کر کے اس کے مقامات کی تفسیرو تشریح بھی کی۔ یہ تصوف کے تاریخی ارتقاء کا عہد بعہد جائزہ تھا۔ اب اس کے عملی پہلو کی جامع انداز میں وضاحت کی جاتی ہے۔

تصوف کا تمام تر تعلق "عمل" ہے۔ اس میدان میں عمل کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایمان کے بعد اعمال صالحہ نہ کئے جائیں تو نجات ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جہاں بھی ایمان کا ذکر کیا ہے۔ وہاں اعمال صالحہ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا۔

وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ○ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○

"قسم ہے زمانے کی۔ بیشک انسان خسارے میں ہے۔ مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے۔ اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔" (سورہ العصر)

اس سورت میں دو باتیں خاص طور پر بیان کی گئی ہیں۔ پہلی بات تو یہ بتائی گئی ہے کہ انسان مکمل طور پر ہے ہی نقصان میں۔ دوسری بات یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ صرف وہ لوگ نقصان اور گھاٹے میں نہیں ہیں جو ایمان لائے اور صرف ایمان ہی نہیں لائے بلکہ ایمان لانے کے بعد نیک اعمال بھی کئے۔ صرف ایمان لے

آنا کافی نہیں جب تک اس ایمان کے مطابق عملی طور پر حقوق و فرائض ادا نہ کئے جائیں۔ اور ایمان لانے کے جو تقاضے ہیں وہ پورے نہ کئے جائیں۔ اس وقت تک وہ ایمان قابل قبول نہیں ہے۔ چونکہ ایمان کے اثرات "عمل" کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لیے تصوف میں سب سے زیادہ اہمیت "عمل" کو دی جاتی ہے۔ تاکہ انسانی کردار میں ایمان کے اثرات ظاہر ہوں۔ اور ان اثرات کی بدولت تغیر رونما ہو۔ قلوب کی اصلاح ہو۔ اذہان کی طہارت ہو۔ اور انسانی سیرت و کردار میں ایسی مثبت تبدیلی آئے جس سے ایک مضبوط انقلاب معرض وجود میں آئے۔ جسے قرآن میں "عروۃ الوثقیٰ" کا نام دیا گیا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی!!

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

(اقبالؒ)

تصوف جہد مسلسل، عمل پیہم اور استقامت کی تلقین کرتا ہے۔ تصوف میں یہ تین اوصاف عملی طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔ نفس امارہ کو نفس لوامہ اور پھر نفس مطمئنہ میں تبدیل کرنا ہی مقصد تصوف ہے۔ یہی شریعت طریقت حقیقت اور معرفت ہے۔ یہ مجاہدے کا کام ہے۔ جس کے لیے مداومت اور مستقل مزاجی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اور حدیث میں احسان یعنی تصوف کی جو تعریف آئی ہے۔ کہ "تو عبادت اس طرح کرے گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے اگر یہ مقام نہ ملے تو کم از کم یہ تو ہو کہ اللہ تعالیٰ تجھے دیکھ رہا ہے۔" یہ مقام یونہی تو نہیں مل جائے گا۔ اس کے لیے عمل پیہم کرنا پڑے گا۔ اور جنہوں نے اس راہ میں نیک اعمال کئے اللہ تعالیٰ انہیں پورا پورا اجر عطا فرمائے گا۔ لیکن بغیر عمل کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا سوائے ذلت و خواری اور ناراضی رب کے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا

اَلِیْمًا ○ وَّلَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا۔

"پھر جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کا پورا پورا اجر دے گا۔ اور اپنے فضل و کرم سے زیادہ بھی عطا کرے گا۔ لیکن جنہوں نے (اعمال صالحہ کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کو) عار سمجھا۔ اور تکبر کیا تو انہیں (اللہ تعالیٰ) دردناک عذاب دے گا۔ اور وہ اللہ کے سوا اپنے لیے نہ کوئی حمایتی پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔" (قرآن ۴: ۱۷۳، ۱۷۴)

پس تصوف مجاہدے کا نام ہے۔ جس میں ہر لحہ جہاد کیا جاتا ہے۔ جہاد اصغر بھی اور اکبر بھی۔

متعلقات تصوف

چونکہ تصوف کا تمام تر تعلق "عمل" سے ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ "متعلقات تصوف" کی وضاحت کر دی جائے۔ جن کے بغیر منزل نہیں ملتی اور صراط مستقیم پر چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انسان اس راہ کی دشواریوں سے گھبرا جاتا ہے پھر اس کی حالت اس شتر بے مہار کی سی ہوتی ہے۔ جس کو جو چاہے جدھر چاہے لے جائے۔

(ا) حقیقت مرشد

اصطلاح تصوف میں "مرشد" سے مراد وہ مرد کامل ہے۔ جو اپنی ایمانی بصیرت سے مرید کی صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرے اور اپنی نگرانی میں منزل مقصود تک پہنچائے۔ اور "مرید" اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے ارادے کو اللہ تعالیٰ کی رضا میں محو کر دے اور اپنے مرشد کی راہنمائی میں ہر طرف سے کنارہ کش ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔

حیات انسانی کی یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ انسان جس فن یا علم سے ناآشنا ہوتا ہے۔ اس کو جاننے کے لیے وہ کسی ماہر فن استاد کی طرف رجوع کرتا ہے۔

تاکہ اس کی راہنمائی اور دستگیری سے اس میں کمال حاصل کر کے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرے۔ جب دنیاوی امور میں بغیر راہنما کے کامیابی کا حصول ممکن نہیں تو دینی اور روحانی امور میں بغیر راہنما اور استاد کے کس طرح کامیابی ممکن ہے؟ جہاں قدم قدم پر نفسانی خواہشات اور شیطانی وسوسے گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ اور وہ ابلیس جس نے تخلیق آدم کے وقت قسم کھائی تھی۔

"فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ "

"کہ (اے اللہ) تیری عزت کی قسم میں ضرور ان سب کو گمراہ کروں گا"

(قرآن ۳۸: ۸۲)

تو وہی ابلیس اب انسان پر ہر طرف سے حملہ آور ہے۔ وہ انسان کو گمراہ کرنے میں کوئی لحہ بھی ضائع نہیں کرتا۔ مگر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ کہ ابلیس کے اس حملے سے صرف اللہ کے "مخلص بندے" ہی محفوظ رہ سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (قرآن ۳۸: ۸۳)

تو اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان، ابلیس کے حملوں سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ان "مخلص بندوں" کی تربیت اور سرپرستی میں آجائے۔ تاکہ جس طریقے سے انہوں نے اللہ کا قرب حاصل کیا ہے اور منزل مقصود یعنی رضائے الٰہی تک رسائی حاصل کی ہے۔ ان سے وہ طریقہ سیکھیں اور ان کی راہنمائی میں صراط مستقیم پر چلتے ہوئے منزل مراد تک پہنچیں ۔۔۔۔۔ یہ قرآن سے ثابت شدہ حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا اور ابتدائے تخلیق انسان ہی سے اللہ تعالیٰ نے اس کی نشاندہی فرما دی تھی۔ انسان توجہ نہ کرے تو الگ بات ہے۔ وہ طریقہ جس کے اندر رہ کر تربیت حاصل کی جاتی ہے وہ "طریقت" ہے۔ اور جس کی راہنمائی میں شریعت کی پیروی کی جاتی ہے وہ مردِ کامل "مرشد" کی ذات ہے۔ اور مرشد اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں میں سے ہوتا ہے۔ اور مخلصین کی وہ جماعت صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کی برگزیدہ اور پاکیزہ جماعت ہے۔ اور یہی "حزب اللہ" ہے سیدھی سی

بات ہے اس میں نہ کوئی فلسفیانہ موشگافی ہے اور نہ کوئی الجھاؤ۔

مرشد روحانی معالج ہوتا ہے جو انسان کے روحانی امراض کا قرآن کے نسخہ کیمیا سے علاج کرتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ شریعت حقہ کی طرف سے بتائے ہوئے پرہیز بھی بتاتا ہے۔ تاکہ "مرید" کا نفس امارہ، نفس لوامہ اور پھر مطمئنہ میں تبدیل ہو جائے۔ مرید جب اپنے مرشد سے شخصی تعلقات قائم کرتا ہے تو اس کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہے۔ اور اس کے واسطے سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑتا ہے۔ اس میں مرید کلی طور پر اپنے آپ کو مرشد کے سپرد کر دیتا ہے۔ وہ اپنی مرضی ختم کر دیتا ہے اور مرشد کی مرضی پر چل پڑتا ہے۔ کیونکہ مریض جب تک اپنے معالج کی مرضی کے مطابق علاج نہیں کرائے گا شفا نہیں پائے گا۔ بعینہ مرید جب تک اپنے مرشد کی مرضی کے مطابق تربیت حاصل نہیں کرے گا اور اپنی مرضی ختم کر کے مرشد کی مرضی کو نہیں اپنائے گا اسے منزل نہیں مل سکتی۔ اس عمل کو طریقت میں "فنا فی الشیخ" کہتے ہیں۔ کہ اپنی نفی کر کے شیخ کی حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس سادہ سی بات کو بھی کس قدر الجھا دیا گیا ہے۔

مولانا رومؒ اپنی مثنوی میں "مرشد کی حقیقت" کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر
ہست بس پر آفت و خوف و خطر
پس رہے را کہ نرفتستی تو ہیچ
ھیں مرو تنہا، ز رہبر سر مپیچ
ہر کہ او بے مرشدی در راہ شد
او زغولان گمرہ و در چاہ شد
گر نباشد سایہ پیر اے فضول

پس ترا سرگشتہ دارد بانگ غول

(مثنوی مولانا روم دفتر اول)

"تو مرشد کو منتخب کرلے کہ بغیر مرشد کے (طریقت) کا یہ سفر بے پناہ آفات اور خوف و خطرات سے بھرا پڑا ہے۔ پس ایک ایسے راستے پر کہ جس پر تو پہلے کبھی نہیں گیا۔ خبردار تنہا نہ چل اور رہبر کی طرف سے روگردانی نہ کر۔ کہ ہروہ آدمی جو بغیر مرشد کے اس راستے پر چلا ہے وہ شیاطین کے ہاتھوں گمراہ ہوا ہے اور (گمراہی کے) کنویں میں جاگرا ہے۔ اے کم عقل! اگر مرشد کا سایہ تجھ پر نہیں تو شیاطین کی آوازیں تجھے گمراہ کردیں گی۔"

اصطلاح تصوف میں طریقت کے اس راستے کو "سلوک" اس پر چلنے والے کو "سالک" اور منازل راہ کو "مقامات" کہتے ہیں۔ یہ منازل راہ درحقیقت صراط مستقیم کے سنگ میل ہیں جن سے گزر کر مسلمان منزل مقصود تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

"مقامات کی تعداد سات ہے۔ توبہ - ورع - زہد - فقر - صبر - توکل اور رضا۔"

(تاریخ تصوف در اسلام)

لیکن ہم نے اس باب میں جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے مقامات کی تعداد آٹھ لکھی ہے۔ ساتویں نمبر پر توکل کے بعد ایک مقام "ایثار" آتا ہے۔ اور آخر پر "رضا" - کیونکہ بغیر ایثار کے مقام رضا حاصل نہیں ہو سکتا۔

ان مقامات میں سے گزرتے ہوئے سالک کے دل پر بعض وجدانی کیفیات طاری ہوتی ہیں، جن کو اصطلاح تصوف میں "احوال" کا نام دیا جاتا ہے۔

"حال" کی کیفیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلب سالک پر طاری ہوتی ہے۔ سالک کو اس وہبی کیفیت پر بذات خود کوئی قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ دل پر طاری ہوجائے تو سالک اسے اپنی کوشش یا ارادے سے ہٹا نہیں سکتا۔ اور اگر خود بخود یہ کیفیت ختم ہو جائے تو سالک کسب و اجتہاد سے اسے دوبارہ واپس نہیں لاسکتا۔

یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور عنایت ہوتی ہے۔

احوال کی تعداد دس ہے۔

۱۔ مراقبہ ۲۔ قرب ۳۔ محبت ۴۔ خوف ۵۔ رجاء ۶۔ شوق

۷۔ انس ۸۔ اطمینان ۹۔ مشاہدہ اور ۱۰۔ یقین۔

ان کی وضاحت "روحانی ارتقاء" کے ذیلی عنوان کے تحت کی جائے گی۔

سالک ان تمام مقامات سے صرف مرشد کامل کی راہنمائی اور تربیت میں رہ کر ہی گزر سکتا ہے۔ اکیلا چلے گا تو گمراہ ہو گا۔

قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُو اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ"

" اے ایمان والو! اللہ (کی ناراضی) سے ڈرو۔ اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو۔ اور اس کی راہ میں مجاہدہ کرو۔ تاکہ تم فلاح پاؤ۔" (قرآن ۵: ۳۵)

وسیلہ کی لغوی تشریح اس طرح ہے: الوسیلة فی الاصل ما یتوصل به الی الشئ و یتقرب به الیه (لسان العرب و کشاف) یعنی جس چیز کے ذریعہ کسی تک پہنچا جائے اور اس کا قرب حاصل ہو اسے وسیلہ کہتے ہیں۔

آیت مذکورہ میں جس وسیلہ کی تلاش کا ذکر ہے اس سے مراد شخصی وسیلہ یعنی توسل مرشد ہے۔ جو لوگ اس وسیلہ سے "ایمان" مراد لیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں کیونکہ اس آیت میں خطاب انہی لوگوں سے کیا گیا ہے جو ایمان لا چکے ہیں جب ایمان موجود ہے تو تلاش کس کی؟ اور جو لوگ اس وسیلہ سے "تقویٰ" مراد لیتے ہیں وہ بھی صحیح نہیں ہیں کیونکہ تقویٰ کی ہدایت اِتَّقُو اللّٰهَ کے الفاظ سے فرما دی گئی ہے اور جو لوگ اس وسیلہ سے مراد "اطاعت، عبادت، یا نیک عمل" لیتے ہیں ان کی رائے بھی درست نہیں ہے کیونکہ یہ ساری باتیں جَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ میں آگئیں۔

وَابْتَغُوْآ اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ کے پہلے اور بعد واؤ عطف ہے۔ جو معطوف اور معطوف الیہ کے درمیان مغائرت کی دلیل ہے۔ کہ جس وسیلہ کی جانب اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ تقویٰ اور مجاہدہ کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی تصریح فرمائی ہے کہ اس آیت میں وسیلہ سے مراد "بیعت مرشد" ہے۔ (سر دلبراں از شاہ محمد ذوقیؒ)

اسی طرح شاہ اسماعیل دہلوی کو بھی لکھنا پڑھا۔

اہل سلوک ایں آیت را اشارت بسلوک مے فہمند و وسیلہ مرشد رامے دانند پس تلاش مرشد بنا بر فلاح حقیقی وفوز تحقیقی پیش از مجاہدہ ضروری است و سنت اللہ برہمیں منوال جاریست لہٰذا بدوں مرشد راہ یابی نادر است۔ (صراط مستقیم)

"یعنی سالکان راہ حقیقت نے وسیلہ سے مراد "مرشد" لیا ہے۔ پس حقیقی کامیابی اور کامرانی حاصل کرنے کے لیے مجاہدہ و ریاضت سے پہلے تلاش مرشد بہت ضروری ہے۔ اور حق تعالیٰ نے سالکان راہ حقیقت کے لیے یہی قاعدہ مقرر فرمایا ہے۔ اس لیے مرشد کی راہنمائی کے بغیر اس کا ملنا شاذو نادر ہے۔"

ایک اور جگہ اسماعیل دہلویؒ لکھتے ہیں۔

و مراد از وسیلہ شخصی است کہ اقرب الی اللہ باشد در منزلت (منصب امارت و سر دلبراں)

"اور وسیلہ سے مراد ایسا شخص ہے جو قدر و منزلت میں اللہ تعالیٰ سے بہت قریب ہو۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وسیلہ کی وضاحت بڑے خوبصورت انداز میں اس طرح کی ہے۔"

دم عارف نسیم صبح دم ہے
اسی سے ریشہ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیبؑ آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

حقیقت میں مقربین بارگاہ رب العزت ہی کا وسیلہ وہ "وسیلہ" ہے جس کے حاصل کرنے کی ہدایت اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمائی ہے۔

"اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّھِمُ الْوَسِیْلَۃَ اَیُّھُمْ اَقْرَبُ وَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَہٗ وَ یَخَافُوْنَ عَذَابَہٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحْذُوْرًا"

"وہ لوگ جنہیں یہ پکارا کرتے ہیں وہ خود ڈھونڈتے ہیں اپنے رب کی طرف وسیلہ' کہ کونسا بندہ (اللہ سے) زیادہ قریب ہے۔ اور امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی۔ اور ڈرتے رہتے ہیں اس کے عذاب سے۔ بیشک آپؐ کے رب کا عذاب ڈرے کی چیز ہے۔" (قرآن ۱۷: ۵۷)

اس آیت سے "وسیلہ شخصی" کی تلاش کا بین ثبوت مل رہا ہے۔ کہ وہ اس کا وسیلہ تلاش کر رہے ہیں جو مقرب بارگاہ الٰہی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوگا وہی بارگاہ الٰہی میں بطور وسیلہ پیش کیا جاتا ہے۔ وہی رشد و ہدایت کی تلقین کر سکتا ہے۔ وہی سالک کا ہاتھ پکڑ کر شریعت کا عصا تھامے' طریقت کے راستے پر گامزن معرفت الٰہی کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ صحابہ کرامؓ سے مختلف اوقات میں مختلف امور پر بیعت لیتے تھے مثلاً اسلام' خلافت' ہجرت' جہاد' اتباع سنت' تقویٰ' ذوق وشوق دین اور حقوق العباد وغیرہ۔ احادیث صحیحہ میں بھی حقیقت مرشد اور بیعت کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے ہم نو آدمی تھے آٹھ یا سات آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم رسول اللہ ﷺ سے بیعت نہیں کرتے۔ ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور عرض کیا۔ کہ اے اللہ کے رسولؐ! ہم کس امر پر آپؐ کی بیعت کریں؟ آپؐ نے فرمایا۔ ان امور پر کہ ----- اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو۔ اور پانچ وقت کی نمازیں ادا کرو۔ اور (احکام) سنو اور اطاعت کرو۔" (صحیح مسلم' ابوداؤد اور نسائی)

"حضرت جریرؓ سے رسول اکرم ﷺ نے بیعت کے وقت یہ عہد لیا کہ

ہر مسلمان کی خیر خواہی کو اپنے اوپر لازم پکڑیں۔
انصار مدینہ سے بیعت کے وقت حضورؐ نے یہ شرط لی کہ امور اسلام میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔ اور جہاں رہیں حق بات کریں۔ اور انصار عورتوں سے اس بات پر بیعت لی کہ میت پر نوحہ خوانی نہ کریں۔
(سردلبراں از سید محمد ذوقی)

قرآن مجید کا اعلان ہے۔
"فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ"
"اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھو" (قرآن ۱۶: ۴۳)

اہل ذکر کون ہیں؟ وہ جنہوں نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی ہمیشہ انہیں یاد رکھا۔ وہ مخلصین کی جماعت جس کے آگے ابلیس بھی عاجز ہے۔ ذکر الٰہی میں مستغرق نفوس قدسیہ جو قرآن و سنت کو مشعل راہ بناتے ہیں وہ اللہ کے مطیع اور اطاعت گزار بندے ہیں۔ اللہ ان کا حامی و ناصر ہے۔ وہی اولیاء اللہ اور صوفیا کرام جو قرآن کے عالم اور سنت کے پیرو ہوتے ہیں جو اس راہ طریقت کے راہی ہیں۔ جنہیں نہ خود کوئی خوف ہے اور نہ اپنے ساتھیوں کا غم۔ جن کی تعریف میں اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرمائیں۔ اور انہیں "عبادالرحمٰن" کے خطاب سے نوازا۔

ختم الرسول حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے بعد بیعت کا طریقہ آپؐ کے خلفاء صحابہ کرامؓ تابعینؒ اور صوفیا کے ہاں منتقل ہو کر آیا۔ اس لحاظ سے مرشد اصالۃً خود رسول اللہ ﷺ ہیں اور مرشدان نیابۃً آپؐ کے خلفاء صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد صوفیا کرام ہیں۔ لہٰذا مرشد کے بغیر اس راہ میں کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس "وسیلہ" کی تلاش کس طرح کی جائے اور سالک کس شخص کو اپنا مرشد اور راہنما بنائے؟ اس سوال کا جواب ہم قرآن و سنت میں تلاش کرتے ہیں۔ جب قرآن نے اس "وسیلہ" کی تلاش کا حکم دیا

تو اس معاملہ میں راہنمائی بھی خود قرآن نے کی ہے۔ ذرا غور و فکر کی ضرورت ہے۔ جس کے لیے ہم اکثر کہہ دیتے ہیں کہ مصروفیات کے اس دور میں ہمارے پاس فرصت نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ"

"اور اس شخص کی پیروی کر جو میری طرف رجوع کرتا ہے" (قرآن ۳۱: ۱۵)

۱۔ اللہ تعالیٰ نے پہلی پہچان یہ بتا دی کہ وہ شخص رجوع الی اللہ کرے گا۔ وہ متقی ہو گا اور اس میں اتباع قرآن و سنت کا ذوق شوق پایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی غیر شرعی کام کرنے والے کی پیروی سے منع کر دیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (قرآن ۷٦: ۲۴)

"اور نہ اطاعت کر ان میں سے کسی گنہگار (بد عمل) یا کفر کرنے والے کی۔"

اس آیت میں بد عمل شخص کو جو غیر شرعی طریقے اپناتا ہے کافر پر مقدم رکھا کیونکہ ایک مومن کو کافر کی صحبت کی نسبت بد عمل اور بد عقیدہ شخص کی صحبت سے زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ لہٰذا راہنما اور مرشد وہ شخص ہو جو شریعت محمدیؐ پر سختی سے کاربند ہو اور صحیح العقیدہ ہو۔ اس کے اعمال سے فسق و فجور کی بو نہ آئے۔ بلکہ حدیث قدسی کے مطابق کہ --- "میرا بندہ وہ ہے جسے دیکھ کر میں یاد آجاؤں" وہ ایسی ہی شخصیت کا مالک ہونا چاہیے پھر اس کی وضاحت حق تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ بھی کر دی۔ فرمایا:

"وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا"

"اور نہ پیروی کر اس (بدنصیب) کی۔ جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ لگا ہوا ہے اپنی نفسانی خواہش کے پیچھے۔ اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے" (قرآن ۱۸: ۲۸)

مرشد کامل ذاکر ہوتا ہے۔ اور جو کوئی اللہ کی یاد سے غافل ہے وہ خود گمراہ ہے۔ وہ دوسروں کی راہنمائی کیا کرے گا۔ وہ تو خود نفس امارہ کے پیچھے لگا ہوا ہے

وہ کسی دوسرے کو نفس مطمئنہ تک کس طرح لے جا سکتا ہے پس حکم ہوا ہے کہ ایسے شخص کی بات بالکل نہ مانیں۔ نہ اس کی صحبت اختیار کریں۔ جو اللہ کی یاد سے غافل ہے۔ اور اپنے نفس کا بندہ بن چکا ہے۔

۲ دوسری پہچان یہ ہے کہ جو شخص صاحب بصیرت ہو اس کی راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

قرآن مجید شاہد ہے:

"قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ"

"(اے رسولؐ) آپؐ فرما دیجئے۔ یہ میرا راستہ ہے۔ میں تو بلاتا ہوں صرف اللہ کی طرف بصیرت پر۔ میں اور (وہ بھی) جو میری اتباع کرتے ہیں"

(قرآن ۱۲:۱۰۸)

اس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ خود بھی لوگوں کو بصیرت کی بنا پر اللہ کی طرف بلاتے تھے اور آپؐ کی اتباع کرنے والے بھی۔ مثلاً صحابہ کرامؓ اہل بیت اطہارؓ اور ان کے بعد صوفیا عظامؒ نبی کریم ﷺ کے سچے متبعین اور صحیح جانشین ہیں۔ اتباع کرنے والوں میں قیامت تک کے صالحین آجاتے ہیں۔ اور رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ اور آپؐ کی اتباع کرنے والے علماء صوفیا اور صلحاء کرام میں سے مرشد بن کر رشد و ہدایت کا کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ اور وہی صاحب بصیرت لوگ ہیں۔ کیونکہ انہوں نے سنت کی اتباع کرکے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ اور یہ حدیث کہ ----- "مومن کی فراست ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔" انہی لوگوں پر صادق آتی ہے۔ اور اس کے مصداق صوفیا کرام ہی ہیں۔ لہٰذا مرشد کامل صاحب بصیرت ہوتا ہے۔

۳ تیسری پہچان یہ ہے کہ جو شخص صاحب نسبت ہو اور کسی بزرگ کی صحبت میں رہ کر کسب فیضان کیا ہو۔ اور باقاعدہ بیعت کرنے کی اجازت حاصل کی ہو اور بیعت کا یہ سلسلہ معلم انسانیت نبی رحمت ﷺ تک پہنچتا ہو۔ پس

ایسی شخصیت کی بیعت کی جا سکتی ہے اور اسے مرشد کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ○ وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا۔"

"اے نبی (ﷺ) ہم نے بھیجا ہے آپؐ کو (سب سچائیوں کا) گواہ بنا کر۔ اور خوشخبری سنانے والا اور (بروقت) ڈرانے والا اور دعوت دینے والا اللہ کی طرف اس کے اذن سے اور روشن آفتاب" (قرآن ۳۳: ۴۵، ۴۶)

اسلام کی دعوت و تبلیغ اور رشد و ہدایت کے لیے جہاں اور بہت سی باتیں ضروری ہیں وہاں اذن الٰہی بھی بہت ضروری ہے۔ نبی کریم ﷺ، اللہ تعالیٰ کے حکم اور اذن کے تحت لوگوں کو رجوع الی اللہ کی دعوت دیتے تھے۔ اور یہ اذن درجہ بدرجہ سلسلہ دار نبی کریم ﷺ سے ہوتا ہوا مرشد تک پہنچتا ہے۔ یہی ارشاد و بیعت کا اذن ہے۔ اور مرشد وہی ہو سکتا ہے جس نے اپنے مرشد کی وساطت سے سلسلہ وار حضور رسالت مآب ﷺ اور اللہ تعالیٰ سے ارشاد و بیعت کا اذن حاصل کیا ہو۔ یہی نسبت ہے۔ جس کو طریقت میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا شیخ و مرشد وہی ہو سکتا ہے جو صاحب نسبت ہو۔ اور بذریعہ سلسلہ طریقت، دعوت و ارشاد اور بیعت کا اذن حاصل کر لیا ہو۔

۴ چوتھی پہچان وہ ہے کہ جس کی وضاحت حضور نبی کریم ﷺ نے خود فرمائی ہے۔ حضورؐ نے حدیث قدسی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "میرا بندہ وہ ہے جسے دیکھ کر میں یاد آجاؤں۔" اللہ کے جس بندے کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ ہو جائے اس شخص سے بھی راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ تقوے کا اثر چہرے پر ہوتا ہے۔ پھر بندے کی ظاہری صورت، اس کی گفتار، کردار اور طرز عمل سے بھی حقیقت حق

نظر آجاتی ہے۔

پس سالک کو چاہیے کہ درج بالا چار اوصاف جب کسی میں پائے تو بغیر کسی عذر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کرلے۔ اور اس پر کلی طور پر بھروسہ اور اطمینان کرکے اس کے احکام کی پابندی کرے۔ اس کی راہنمائی میں منازل سلوک طے کرے اور منزل مقصود تک پہنچنے میں کوشاں رہے۔ اور یاد رہے کہ سالک کی منزل "اللہ تعالیٰ" ہے۔

رسول اللہ ﷺ روشن چراغ ہیں۔ جن سے لاتعداد چراغ روشن ہوئے۔ اور قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ دین کے یہ چراغ صوفیاء کرام ہیں۔ جن کے نور سے قلوب روشن ہوتے ہیں۔

شیخ و مرشد کا ادب

ادب ایک ایسی کنجی ہے جس سے فیض کا دروازہ کھلتا ہے۔ بے ادب نہ شریعت میں مقام حاصل کرسکتا ہے اور نہ طریقت سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ سب سے پہلے ابلیس نے بارگاہ الٰہی میں بے ادبی اور نافرمانی کا مظاہرہ کیا تو مردود ٹھہرا۔ ابولہب اور ابو جہل نے بارگاہ رسالتؐ میں بے ادبی دکھائی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہلاکت و بربادی ان کا مقدر بن گئی۔ اللہ تعالیٰ نے والدین کی نافرمانی اور بے ادبی کو گناہ کبیرہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح مرشد پاک کا بے ادب اور نافرمان' رسول اللہ ﷺ کے فیض رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ ہادی برحق حضرت محمد ﷺ کا ارشاد پاک ہے۔

> "وہ شخص ہم میں سے نہیں جس نے ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کیا اور ہمارے بزرگوں کا ادب و احترام نہیں کیا۔" (ترمذی شریف)

تصوف تو ہے ہی ادب۔ جیسا کہ صوفیائے فرمایا۔ اَلتَّصَوَّفُ کُلُّہٗ اَدَبٌ شیخ کامل کے آداب کے متعلق امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات عالیہ ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں۔

"اگر اللہ تعالیٰ اپنی عنایت سے کسی طالب کو پیر کامل کی طرف راہنمائی فرمائے۔ تو چاہئے کہ اس کے وجود مسعود کو غنیمت سمجھے۔ اور اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے حوالے کر دے۔ اس کی رضا میں اپنی سعادت جانے اور اپنی بدبختی کو اس کی مرضیات کے خلاف سمجھے۔۔ اپنی نفسانی خواہش کو اس کی رضا کے تابع کر دے۔ حدیث نبویؐ ہے: "تم میں سے کوئی ایمان والا نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس کے تابع نہ ہو جائے جو میں لایا ہوں یعنی قرآن و سنت۔" طالب کو چاہئے کہ اپنے دل کی توجہ تمام اطراف سے پھیر کر اپنے پیر و مرشد کی طرف کرلے۔ اس کی اجازت کے بغیر نوافل و اذکار میں مشغول نہ ہو۔ اور اس کے حضور میں نماز فرض و سنت کے سوا کچھ نہ پڑھے۔ مرشد کے مصلے پر پاؤں نہ رکھے۔ اس کے وضو کی جگہ پر وضو نہ کرے اور اس کے خاص برتنوں کو بغیر اجازت استعمال نہ کرے۔ اور نہ ہی بغیر اجازت اس کے حضور پانی پیئے یا کھانا کھائے اور کسی سے گفتگو کرے۔ اس کی عدم موجودگی میں جہاں وہ مقیم ہو اس طرف پاؤں دراز نہ کرے۔ اور لعاب دہن بھی اس طرف نہ پھینکے۔

جو کچھ مرشد سے صادر ہو اسے صواب و بہتر جانے۔ کیونکہ مرشد کامل کا عمل الہام سے ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض صورتوں میں اس کے الہام میں خطا کا ہونا ممکن ہے لیکن خطائے الہامی' خطائے اجتہادی کی طرح ہے۔ اور ملامت و اعتراض اس پر جائز نہیں۔ جب اسے اپنے شیخ و مرشد سے محبت ہے تو پھر اقتداء میں کوئی مشکل نہیں۔ اور اس کا ہر فعل نظر میں پسندیدہ دکھائی دے گا۔ کھانے پینے پہننے اور طاعت کے چھوٹے بڑے کاموں میں پیر و مرشد ہی کی اقتداء کرنی چاہیے۔ اور نماز کو بھی اسی طرح ادا کرنا چاہئے۔ اور فقہ بھی اسی طریقہ و عمل سے سیکھنی چاہئے۔

مرید اپنے پیر و مرشد سے کرامت طلب نہ کرے۔ اور اپنے کشف پر بھروسہ نہ کرے۔ تمام فیوض و برکات کو اپنے پیر کی طرف ہی سے تصور کرے۔ پیر کی حرکات و سکنات میں کسی اعتراض کو دخل نہ دے۔ خواہ وہ اعتراض رائی برابر ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اعتراض کا نتیجہ سوائے محرومی کے اور کچھ نہیں۔ تمام مخلوقات

میں بدبخت وہ ہے جو اس طائفہ عالیہ پر اعتراض کرتا ہے۔ اور عیب نکالتا ہے۔

مرید کو چاہیے کہ بغیر ضرورت و اجازت کے مرشد سے جدا نہ ہو۔ اپنی آواز کو اس کی آواز پر بلند نہ کرے۔ کیونکہ یہ بے ادبی ہے۔ جو فیض دوسرے مشائخ سے پہنچے تو اسے بھی اپنے ہی پیر کی طرف سے سمجھے۔ اور جان لے کہ پیر کامل تمام کمالات اور فیوض و برکات کا جامع ہے۔ طریقت میں آداب صحبت کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ تاکہ فائدہ حاصل کرنے اور فائدہ پہنچانے کا راستہ کھل جائے۔ مرید کو چاہیے کہ جو کچھ ظاہر ہوتا رہے ضرور لکھتا رہے۔ ہر تین دن کے بعد اپنے حالات و واقعات کی اطلاع شیخ کو دے۔ اگر شیخ کی طرف سے کوئی کپڑا ملے تو اسے کبھی کبھی باوضو پہنے۔ اور ادب کے ساتھ رکھے۔ اس سے بہت سے فوائد کی امید ہوتی ہے۔ کوئی بے ادب اللہ تک نہیں پہنچتا۔ اگر مرید آداب میں سے بعض کی رعایت میں اپنے آپ کو کوتاہ جانے اور اسے کماحقہ' ادا نہ کر سکے اور باوجود کوشش کے بھی پورا نہ کر سکے تو معاف ہے۔ لیکن کوتاہی کا اقرار ضروری ہے۔ اگر آداب کا لحاظ نہ رکھے اور اپنے آپ کو کوتاہ بھی نہ جانے تو ان بزرگوں کی برکتوں سے محروم ہے۔"

(مکتوبات امام ربانی دفتر اول)

(ب) حقیقت بیعت

بیعت ایک سودا ہے جو پختہ معاہدے کے تحت مرشد کامل کی وساطت سے اللہ تعالٰی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ سورہ توبہ میں ارشاد باری تعالٰی ہے۔

"اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ"

"یقیناً" اللہ تعالٰی نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں" (آیت ۱۱۱)

"فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ"

"(اے ایمان والو) پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ تعالٰی سے کیا

ہے اور یہی تو سب سے بڑی کامیابی ہے۔" (ایضاً)

اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے ایک سودا طے کر لیا ہے۔ کہ دیکھو یہ جان و مال جو میرے ہی عطا کردہ ہیں اور فانی بھی ہیں یہ مجھے دے دو اور ان کے بدلے میں میں تمہیں جنت عطا کروں گا جو ہمیشہ تمہارے پاس رہے گی۔ اگر ہم اس سودے کی گہرائی اور کیفیت پر غور کریں تو چند ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جن سے اس سودے کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً پہلی بات یہ ہے کہ یہ سودا صرف اہل ایمان سے کیا گیا ہے۔ کسی کافر مشرک اور بے ایمان کا اس سودے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے صرف دو ایسی چیزیں مانگی ہیں جو ذاتی طور پر ان کی اپنی نہیں ہیں بلکہ خالق نے جو جان و مال کا حقیقی مالک ہے یہ دو چیزیں ایمان والوں کو اپنی طرف سے عطا فرمائی ہیں اور ان کا امین بنایا ہے۔ کہ یہ میری طرف سے امانت ہیں ان میں خیانت نہیں کرنی بلکہ جب ضرورت پڑے یہ مجھے مِنْ و عَن لوٹا دینی ہیں تیسری بات یہ ہے کہ جان و مال ضرورت پڑنے پر لے لوں گا اور اس کا بدلہ یعنی جنت موت کے بعد دوں گا۔ چوتھی بات یہ ہے کہ یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ بہت ہی سستا ہے۔ اس لیے تم اس سودے پر خوشیاں مناؤ۔ شکر ادا کرو۔ کیونکہ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

یہ سودا جہاں بہت سستا ہے کہ دو کم قیمت چیزیں یعنی جان و مال جو فانی اور ناپائیدار بھی ہیں ان کی قیمت اتنی گراں عطا فرمائی جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے یعنی جنت۔ اور اس کے اندر کی دائمی نعمتیں جن کی کوئی مثل نہیں، وہاں یہ سودا کڑی آزمائشوں اور مشکل امتحانوں سے گزر کر برقرار رکھنا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلی آزمائش تو یہ ڈال دی کہ ہمیں خود مختار بنا دیا۔ ہمیں آزادی دے دی کہ ہم جان و مال کو یا تو اللہ کی عطا کردہ چیزیں سمجھ کر مالک حقیقی اسی کو سمجھیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں ہم تو صرف ان کے امین ہیں کہ جیسا ہمیں حکم دیا ہے ہم ان کا استعمال کرتے ہیں اور جب وہ مانگے گا ہم برضا و رغبت واپس کر دیں گے۔ یا پھر خود مالک بن

بیٹھیں۔ کہ یہ جان بھی ہماری ہے اور مال بھی ہمارا اپنا ہے۔ ہم نے کمایا ہے۔ ہم اپنی ذات کے علاوہ کیوں کسی اور پر خرچ کریں؟ ہم تو ایک پیسہ بھی کسی اور کو نہیں دیں گے اور جان' جان سے قیمتی کون سی چیز ہے بھلا۔ ہم کیوں اس کی قربانی دیں۔ مکمل قربانی تو ایک طرف ہم تو اپنی قیمتی جان کو ذرہ بھر تکلیف میں بھی نہیں دیکھ سکتے----
پہلی آزمائش تو یہ ڈال دی گئی ہے۔ کہ ہمیں آزاد کر دیا گیا ہے۔ خواہ مالک کے نمک خوار بن کر زندگی بسر کریں یا پھر نمک حرام بن جائیں اور اپنی من مانی کریں۔

دوسری آزمائش یہ رکھ دی گئی ہے کہ اس سودے کا معاوضہ نقد نہیں دیا جا رہا صرف وعدہ کیا گیا ہے۔

ہمیں اس بات پر خود مختار بنا دیا کہ اگر اللہ پر اعتبار ہے تو معاہدہ کرلو۔ سودے پر راضی ہو جاؤ اور اگر (نعوذ باللہ) اعتبار نہیں ہے تو پھر تمہاری مرضی۔ خود مختاری دے دینا بھی بہت بڑا امتحان ہے۔ یہ تو پھر بندے کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا نا کہ مانے یا نہ مانے۔ کیونکہ جو کچھ بھی جانی اور مالی قربانیاں ہم دیں گے ان کا مکمل معاوضہ عملی طور پر موت کے بعد جنت کی صورت میں ملے گا۔ اس زندگی میں نہیں۔ یہ سودا اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے طے کرلیا ہے۔ اب اس کی توثیق شخصی وسیلے کے ذریعے ہر مومن پر واجب ہے۔

شخصی وسیلہ مرشد کی ذات ہے۔ اس دنیا میں ایک عام سودا طے کرنا ہو تو اس کے لیے کئی قسم کی کاروائی کرنا پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جیسی اعلیٰ و ارفع اور برتر ہستی کے ساتھ جان و مال جیسی بیش قیمت چیز کا معاملہ طے کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ بلکہ یہ معاملہ نہایت مہتمم بالشان ہے جسے انتہا درجے کی سنجیدگی' بڑے اہتمام اور عزم بالجزم کے ساتھ عمل میں لانے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس بیع کا آغاز ہادی برحق ﷺ کی وساطت سے ہو چکا ہے۔ حضورؐ کے بعد یہ سودا ہمیشہ اس متقی اور برگزیدہ شخص کی وساطت سے عمل میں لایا جائے گا جو اس سنجیدہ اور مہتمم بالشان معاملہ میں "وسیلہ" بننے کا مجاز ہوگا۔

نفس امارہ جب توبہ کرتا ہے تو ایک تابع فرمان بندے کی طرح اللہ تعالیٰ کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور اپنے قلب کی اس تبدیلی کے متعلق تمام ضروری شرائط کو پورا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس رجوع الی اللہ کو "بیعت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب کوئی چیز طے شدہ معاہدے کے تحت دی جاتی ہے تو اس کے بدلے میں دوسری چیز لے لی جاتی ہے۔ اس لین دین کو "بیع" کا نام دیا جاتا ہے۔ بندہ اپنے خیالات فاسدہ اور فسق و فجور سے تائب ہو کر اپنے اعضاء و جوارح کو بہ رضاؤ رغبت جب اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتا ہے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اپنی رضا و خوشنودی عطا فرماتا ہے۔

بیعت ایک سودا ہے جو پختہ معاہدے کے تحت مرشد کی وساطت سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ طے کیا جاتا ہے۔ یہ سنت نبوی ہے۔ جس کو آپؐ کے بعد آپؐ کے صحابہؓ اور ان کے بعد صوفیا کرامؒ نے جاری رکھا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ"

"(اے محبوبؐ) بے شک جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے" (قرآن ۴۸: ۱۰)

اہل حقیقت کہتے ہیں کہ یہ آیت بعینہ اس فرمان الٰہی کی طرح ہے کہ "جو رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔" آج جب ہم کسی ولی کامل کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں تو یہ اسی سنت کا اتباع ہے۔ علامہ اسماعیل حقیؒ لکھتے ہیں۔

ترجمہ: اس آیت سے بیعت کی سنت اور مشائخ کبار سے اکتساب فیض ثابت ہوتا ہے وہ مشائخ جنہیں اللہ تعالیٰ نے قطب ارشاد پر فائز کیا ہے۔ وہ اس طرح کی علمی تجلی سے ترقی دے کر انہیں مشاہدہ کی تجلی تک پہنچا دیا جاتا ہے۔"

(تفسیر روح البیان)

حضور نبی کریم ﷺ، صحابہ کرامؓ سے اکثر اوقات، مختلف امور پر بیعت

لیا کرتے تھے۔ اور ایسی ہی بیعت صحابہ کرامؓ نے تابعین سے لی تھی۔ اور پھر صوفیاء میں یہ سلسلہ جاری رہا اور آج تک مختلف سلاسل طریقت کے ذریعے جاری ہے۔ بیعت کرتے وقت سالک خلوص نیت سے ہاتھ بڑھائے اور بیعت کے تمام آداب و شرائط کو ملحوظ خاطر رکھے۔ بیعت ایک وعدہ ہے جو مرید' مرشد کو گواہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے۔ لہٰذا مرید کو لازم ہے کہ وہ اپنے وعدے کا پاس کرے۔ اس پر ہمیشہ قائم رہے جب وہ ایسا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نوازا جاتا ہے۔ اور جو کوئی اس عہد کو توڑتا ہے تو اس کا وبال اسی پر پڑتا ہے۔

"فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَ مَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا"

"پس جس نے توڑ دیا اس (عہد) کو تو اس کے توڑنے کا وبال اس کی اپنی ذات پر ہو گا۔ اور جس نے پورا کیا اس عہد کو جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو (اللہ) عنقریب اس کو اجر عظیم عطا فرمائے گا" (قرآن ۴۸: ۱۰)

اس لیے ضروری ہے کہ سالک بیعت کرنے میں پوری طرح سنجیدہ ہو اور وہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ سے ایک عہد کر رہا ہے اور اس عہد کا توڑنا وبال جان بن جائے گا۔ اور جو اس کو پورا کرے گا اسے اجر عظیم یعنی مقام رضا حاصل ہو گا۔ اور یہی مقصود حیات ہے۔ یہی مقربین کا مقام ہے۔ یہی روحانیت کا عروج ہے۔ اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ"

"اے ایمان والو! اللہ (کی ناراضی) سے ڈرتے رہا کرو۔ اور ہو جاؤ سچے لوگوں کے ساتھ۔" (قرآن ۹: ۱۱۹)

کیونکہ یہ جو سچے اور مخلص بندے ہوتے ہیں ان پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا۔ اور جو شخص ان کی بیعت کر کے صحبت اختیار کر لے اور ان کے تعاون اور راہنمائی میں اپنی اصلاح کر لے تو وہ بھی شیطان کے وسوسوں اور مہلک چالوں سے

بچا رہتا ہے۔ اس سے بڑی سعادت اور کون سی ہو سکتی ہے۔ اس حکم سے روگردانی کس قدر اللہ کی رحمت سے محرومی کا باعث بنے گی!!

بیعت کرنے کے بعد شیخ و مرشد کی صحبت بہت ضروری ہوتی ہے۔ قربت کا ایک لحہ بھی غنیمت جاننا چاہیے۔ اور اسے اللہ کا فضل سمجھنا چاہیے۔ جیسا کہ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

رہبر کامل ' ہادی اکمل حضور نبی رحمت ﷺ نے صالحین کی صحبت حاصل کرنے کی تائید فرمائی ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے۔

"کیا میں تمہیں دین کی اصل نہ بتاؤں؟ جس سے تم دنیا اور آخرت کی بھلائی پالو؟ ذکر الٰہی کرنے والوں کی محفلوں کو اپنے اوپر لازم کرلو۔ اور تنہائی میں بھی حسب استطاعت اپنی زبان سے ذکر کرتے رہو۔"

حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ "اچھے اور برے ہم نشین کی مثال مشک (کستوری) اٹھانے والے اور دھونکنی دھونکنے والے کی ہے۔ مشک فروش یا تو تجھے مشک کا تحفہ دے گا یا تو اس سے خود خریدے گا۔ ورنہ اس کی خوشبو ضرور تجھے پہنچے گی اور اسی طرح دھونکنی دھونکنے والا یا تو تمہارے کپڑوں کو جلائے گا یا تو اس سے بدبو پائے گا۔" (صحیح بخاری)

صحابہ کرامؓ آپس میں ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے۔ "ہمارے ساتھ ذرا بیٹھو تاکہ اللہ کا ذکر کرکے ایمان تازہ کریں۔" حضورؐ کا ارشاد ہے اَلْمَرءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (بخاری و مسلم)

"ہر شخص کی سنگت اس کے ساتھ ہوگی جس سے وہ محبت کرتا تھا۔"

شیخ و مرشد چونکہ روحانی معلم بھی ہوتا ہے اس لیے اس کی صحبت میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کرنا طریقت کا لازمی جزو ہے۔ کیونکہ مرید جب تک مرشد کی صحبت میں بیٹھے گا اس پر اللہ کی رحمت برستی رہے گی۔ اسے تسکین قلب حاصل ہو

گی اور اتنی دیر تک وہ گناہ سے بچا رہے گا۔ شیطان اس سے دور رہے گا۔ صوفیا نے صحبت شیخ کی اہمیت پر بڑا زور دیا ہے۔ صحابہ کرامؓ کو جو اعلیٰ مقام نصیب ہوا اس کی وجہ حضورؐ کی صحبت باکمال تھی کہ جس صحابیؓ کو بھی حضورؐ کی زیادہ صحبت نصیب ہوئی اس کا مقام اتنا ہی بلند ہوگیا۔

حضرت علی بن عثمان الہجویری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "مرید کے لیے سب سے اہم چیز ہم نشینی ہے۔ اور لامحالہ ہم نشینی کے حقوق کی پاسداری فرض ہے۔ مرید کے لیے تنہائی ہلاکت ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "شیطان تنہا آدمی کے ساتھ ہوتا ہے اور دو سے دور رہتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

صحبت شیخ کے بارے میں صوفیا نے جو اس قدر تاکید فرمائی ہے یہ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ صوفیا کا کوئی قدم بھی سنت سے باہر نہیں ہوتا۔ شیخ کی ذاتی توجہ کی بھی مرید کو ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ حضرت شدادؓ بن اوس اور عبادہؓ بن صامت نے فرمایا کہ ہم دونوں بارگاہ رسالت میں حاضر تھے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "تم میں کوئی بیگانہ تو نہیں؟ ہم نے عرض کیا۔ "نہیں یا رسولؐ اللہ" تو ارشاد ہوا۔ "دروازہ بند کردو۔ اور اپنے ہاتھ بلند کرو، اور کہو۔ لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰہُ"

کچھ دیر ہم نے اپنے ہاتھوں کو بلند رکھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک نیچے کیا۔ اور فرمایا۔ "الحمد للہ - اے اللہ تو نے مجھے اس کلمے کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ اور اس کلمے کا حکم دیا اور میرے ساتھ وعدہ فرمایا کہ جو اس کلمے پر پکا رہے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اور تو اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔" پھر فرمایا اے فرزندان اسلام! تمہیں خوشخبری ہو اللہ تعالیٰ نے تمہیں بخش دیا۔"

یہ حضورؐ کی صحبت خاص تھی جس سے حضورؐ نے تنہائی میں اپنے دو مریدوں پر نظر کرم فرمائی اور دعا سے نوازا۔

مرید کے لیے ضروری ہے کہ وہ--------

۱- اپنے شیخ و مرشد کو اپنا روحانی طبیب سمجھے اور اس کے حکم پر دیانت داری کے ساتھ کاربند رہے۔

۲- اپنے مرشد کی کسی بات سے بدظن نہ ہو۔ اور نہ ہی دل میں شبہات کو آنے دے۔

۳- مرشد کے احکام کے ظاہر پر عمل کرے خود تاویل کرکے اس کا کوئی حکم اپنی رائے سے بدل نہ دے۔

۴- مرشد کی صحبت کو غنیمت جانے اور اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے حوالے کردے۔ مُرشد کی رضا میں اپنی سعادت جانے۔

۵- مرشد کی صحبت میں آداب کا خیال رکھے۔ کیونکہ بے ادب نہ شریعت میں مقام حاصل کر سکتا ہے اور نہ طریقت سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔

۶- کوئی کام بھی مرشد کی اجازت اور مشورے کے بغیر نہ کرے۔ اور جو کچھ مرشد سے صادر ہو اسے بہتر جانے۔

۷- مرشد سے کرامت طلب نہ کرے۔ اگر دل میں کوئی شبہ ہو تو بلاتوقف عرض کرے۔ اگر حل نہ ہو تو اپنی تقصیر سمجھے اپنے کشف پر بھروسہ نہ کرے۔ تمام فیوض و برکات کو اپنے شیخ کی طرف سے تصور کرے۔

۸- مرید کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو مگر وہ ہمیشہ یہی سمجھے کہ علم میں شیخ و مرشد مجھ سے بہت آگے ہے۔

۹- مرید اپنے شیخ کی خوشنودی حاصل کرے۔ کیونکہ مرید کے دل میں شیخ کی جس قدر محبت زیادہ ہوگی اسی قدر فیض کی زیادتی ہوگی۔

تجدید بیعت

درج ذیل صورتوں میں تجدید بیعت صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہو جاتی ہے۔

۱- شیخ کا وصال ہو چکا ہو۔ اور مرید ابھی سلوک کی منازل پوری نہ کر سکا ہو۔

اور اس میں یہ اہلیت اور استطاعت بھی نہ ہو کہ وہ مرشد کے مزار پر حاضر ہو کر اپنی منازل سلوک کو تمام کر سکے گا۔ ایسی صورت میں تجدید بیعت ضروری ہو جاتی ہے۔

۲۔ بیعت کرنے کے بعد اگر اس بات کا یقینی علم ہو جائے کہ مُرشد صاحبِ نسبت نہیں ہے۔ تو کسی دوسرے شیخ کی بیعت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ طریقت میں نسبت کا ہونا بنیادی شرط ہے۔ اگر نسبت ہی نہیں تو بیعت واقع ہی نہیں ہوتی۔

۳۔ جب شیخ کی طرف سے کسی مرید کے ساتھ مسلسل بے توجہی اور بے التفاتی رہے اور مرید کی معنوی تربیت و اصلاح نہ ہو رہی ہو تو کوئی دوسرا مرشد ایسے شخص کو بیعت کر کے تربیت معنوی کر سکتا ہے۔

۴۔ اگر والدین کسی بچے کو ابتدائی بچپن میں جبکہ وہ ابھی ناسمجھ ہوتا ہے کسی بزرگ کا بیعت کروا دیتے ہیں۔ اس طرح بیعت تو ہو جائے گی لیکن یہ بیعت تبرک کہلائے گی جب وہ بچہ بالغ ہوتا ہے۔ اور بیعت کی حقیقت کو جان لیتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو کسی دوسرے بزرگ کی طرف مائل پاتا ہے اور اس کی صحبت میں بیٹھ کر اسے اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے تو وہ اس دوسرے بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کر سکتا ہے۔

۵۔ کسی سفر میں کسی بزرگ کے ساتھ اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ اور اس بزرگ کی بیعت بھی کر لی گئی ہو اور وہ بزرگ اپنا پتہ بتائے بغیر چلے جائیں اور مرید ان تک رسائی حاصل نہ کر سکے یا شیخ ہجرت کر کے کسی دوسرے ملک چلے گئے ہوں اور مرید اس سے بے خبر رہ گیا ہو۔ اور تلاش کے باوجود پتہ نہ چل سکے تو ان صورتوں میں تجدید بیعت کی جا سکتی ہے۔

(ج) روحانی ارتقاء

روحانیت ----- دراصل انسانیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ انسان جب

نفسانی خواہشات یعنی نفس امارہ کی بندگی سے نکل کر کمال انسانیت کی طرف پیش قدمی کرتا ہے اور اخلاق و اوصاف انسانی سے آراستہ ہو کر رضائے الٰہی کے بلند ترین نصب العین تک رسائی حاصل کرنے کی کامیاب سعی کرتا ہے تو یہی اس کا روحانی ارتقاء ہے۔

قرآن حکیم نے انسانی شخصیت کے دو رخ بیان کئے ہیں۔ سورہ القیامہ میں ارشاد ہوا۔

۱ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ○ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ○

"کتنے ہی چہرے اس روز قیامت ترو تازہ ہوں گے (اور) اپنے رب (کے انوار جمال) کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔"

۲ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ○ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ○

"اور کئی چہرے اس روز اداس ہوں گے یہ خیال کرتے ہوئے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہونے والا ہے۔

سورہ عبس میں فرمایا:

۱ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ○ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ○

"کتنے ہی چہرے اس دن (نور ایمان سے) چمک رہے ہوں گے۔ ہنستے ہوئے خوش و خرم۔"

۲ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ○ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ○ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ○

"اور کئی چہرے اس دن غبار آلود ہوں گے کالک زدہ سیاہ۔ یہی وہ کافر و فاجر لوگ ہوں گے۔"

پوری انسانیت ان دو قسم کے چہروں میں بدل جائے گی۔ اور چہروں کی اچھی اور بری کیفیت کا انحصار انسان کی باطنی کیفیت پر ہو گا۔ اگر دنیا میں رہ کر اندر کے انسان کو مومن بنا کر نیک اعمال کرتا رہا تو نتیجتہ روز قیامت چہرے ہشاش

بشاش اور ترو تازہ ہوں گے اور اگر بد قسمتی سے اندر کے انسان کو فاسق و فاجر اور منکر بنائے رکھا تو چہرے سیاہ اور خاک آلود ہوں گے۔ نور ایمان سے روشن ضمیری پیدا ہوتی ہے تو ظاہری شخصیت روشن ہو جاتی ہے۔ کفر کی تاریکی مردہ ضمیری پیدا کرتی ہے تو ظاہری شخصیت سیاہ ہو جاتی ہے معصیت کی سیاہی چہروں کو تاریک کر دیتی ہے۔ روحانی ارتقاء کا آغاز باطنی اصلاح سے ہوتا ہے۔ کیونکہ روح جو لطیف ہے اور امر رب سے ہے۔ اس کا مرکز خاص قلب انسانی ہے جس کی طہارت و پاکیزگی پر ہی پورے جسم انسانی کی پاکیزگی کا انحصار ہے۔ وہیں سے تقوے کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اور اگر قلب انسانی کفرو شرک اور فسق و فجور کی الائشوں سے آلودہ ہو گیا تو پھر انسان کی مختلف حالتیں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ جن کی نشاندہی قرآن حکیم نے مختلف مقامات پر کر دی ہے۔

مثلاً۔۔ بے شک انسان خسارے میں ہے	(سورہ العصر)
بے شک انسان ظالم اور ناشکرا ہے۔	(سورہ ابراہیم)
انسان ظلوم بھی اور جہول بھی ہے۔	(سورہ احزاب)
حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا ناشکر گزار ہے۔	(سورہ العدیت)
انسان بخیل ہے	(سورہ محمد)
انسان مایوس' ناشکرا اور شیخی باز ہے	(سورہ هود)
انسان خلقتہ ضعیف ہے۔	(سورہ النساء)
انسان مکار ہے	(سورہ یونس)
انسان احسان فراموش ہے	(سورہ الفجر)
انسان اپنے رب کو بھول جاتا ہے۔	(سورہ الحشر)
انسان بڑا جلد باز ہے۔	(سورہ بنی اسرائیل)
انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔	(سورہ الکهف)
انسان نافرمان ہے۔	(سورہ مائدہ)

انسان سرکش ہے۔ (سورہ العلق)

انسان غافل ہے۔ (سورہ یونس)

انسان لالچی ہے۔ (سورہ العدیت)

انسان بدعہد اور فاسق و فاجر ہے۔ (سورہ الاعراف)

انسان مشرک ہے۔ (سورہ یوسف)

انسان کفر کرتا ہے۔ (سورہ النحل)

مگر

"اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ○ "

(سورہ التین)

"سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے"

سورہ العصر میں تو واضح کر دیا کہ زمانے کی قسم۔ بے شک انسان خسارے میں ہے۔ مگر وہ لوگ خسارے میں نہیں ہیں جو ایمان لائے اور ایمان لانے کے بعد نیک اعمال بھی کرتے رہے نیز اجتماعی طور پر بھی معاشرے میں حق بات کی تلقین اور آزمائش کے وقت صبر کرنے کی تاکید بھی کرتے رہے۔ ایسے انسان ہی باطنی اور روحانی طور پر ارتقائی منازل طے کر کے منزل مقصود تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں اور یہی حقیقی کامیابی اور فلاح و کامرانی ہے ان کے علاوہ تمام انسان ناکام و نامراد ہیں خواہ دنیا میں کتنی ہی کامیابیاں حاصل کر لیں آخرت کی حقیقی زندگی میں ان کے لیے جہنم کی آگ کے علاوہ کچھ نہیں ہو گا۔ ایسے ہی لوگوں کے چہرے سیاہ اور خاک آلود ہوں ------ لیکن عباد الرحمٰن یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جو اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ جو اسے رحمٰن و رحیم سمجھتے ہیں۔ اس کی ناراضی سے ڈرتے ہیں۔ ان کی شان اور سیرت و کردار میں سورہ فرقان کی چودہ آیات نازل کی گئیں۔

آیات کا ترجمہ

"اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر (پُر وقار انداز میں) نرم روی سے چلتے ہیں۔ اور جب مخاطب ہوں ان سے جاہل (لوگ) تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ جو دعائیں کرتے ہیں۔ اے ہمارے پالنے والے۔ دور فرما ہم سے عذاب جہنم۔ بے شک اس کا عذاب بڑا مہلک ہے۔ بہت ہی برا ٹھکانا اور بری جگہ ہے۔ وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔ بلکہ ان دونوں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔ اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور خدا کو نہیں پکارتے اور نہیں قتل کرتے کسی جان کو جس کا قتل اللہ نے حرام کر دیا ہے۔ اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔ جو کوئی یہ کام کرے گا وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا۔ دوگنا کر دیا جائے گا اس کے لیے عذاب روز قیامت۔ اور ہمیشہ رہے گا اس میں ذلیل و خوار ہو کر۔ مگر وہ جس نے (ان گناہوں سے) توبہ کی اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے لگا ہو۔ تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ نیکیوں میں بدل دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اور جس نے توبہ کی اور نیک کام کیے تو اس نے رجوع کیا اللہ تعالیٰ کی طرف جیسے رجوع کرنے کا حق ہے۔ (اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے۔ اور جب ان کا گزر کسی لغو (کام) کے پاس سے ہوتا ہے تو باوقار طریقے سے گزر جاتے ہیں اور جب انہیں ان کے رب کی آیات کے ساتھ نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں گر پڑتے (بلکہ غور و فکر کرتے ہیں) اور وہ جو عرض کرتے رہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔۔۔۔ یہ ہیں (رحمٰن کے وہ خوش نصیب بندے) جن کو بدلے میں ملے گا (جنت کا) بالاخانہ ان کے صبر کی وجہ سے اور وہاں ان کا استقبال آداب و تسلیمات سے کیا جائے گا (اور وہ) ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے۔ جو بہت عمدہ ٹھکانہ اور قیام گاہ ہے۔"

انسان کو بتایا جا رہا ہے کہ اے انسان! تجھے رحمٰن کی معرفت صرف رحمٰن کے ان بندوں سے حاصل ہو سکتی ہے جو اپنی پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی بسر

کرتے ہیں۔ ان کی سیرت کو دیکھو۔ اور پھر اپنے آلودہ دامن اور بے نور چہروں پر نظر ڈالو۔ حقیقت خود ہی آشکارا ہو جائے گی۔ روحانی ارتقاء کے لیے عباد الرحمٰن جیسی صفات اپنانا ضروری ہے۔

اللہ ---- رحمٰن و رحیم نے سب سے پہلے اپنے پیارے بندوں کی چال کا ذکر کیا۔ کہ ان کی چال ہی نرالی ہے۔ جسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وقار و متانت کا ایک پیکر رعنا چلا آ رہا ہے۔ جس میں نہ تو متکبر لوگوں جیسی رعونت ہے اور نہ بے فکر اور کاہل و ناکارہ لوگوں جیسی سستی اور چھچھورا پن پایا جاتا ہے۔ اور نہ ہی ان کی رفتار میں انکسار کی ریاکاری ہوتی ہے۔

وہ عام لوگوں میں چلتے پھرتے ہی الگ پہچانے جاتے ہیں۔ چال محض انداز رفتار ہی کا نام نہیں بلکہ درحقیقت ذہن اور سیرت و کردار کی اولین ترجمان بھی ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے بندوں کی چال ڈھال کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے۔ کہ وہ نرم روی سے چلتے ہیں جس میں وقار تمکنت اور احساس ذمہ داری کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔

ان کے اخلاق عالیہ کی دوسری خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ جہالت کے مقابلے میں سلامت روی اختیار کرتے ہیں۔ وہ جہلا سے الجھتے نہیں اور نہ ان کی سطح پر اتر کر ویسا ہی جواب دیتے ہیں بلکہ سلام کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ یہاں جہالت سے مراد بے علمی یا کسی کا ان پڑھ ہونا مراد نہیں بلکہ برے رویے کو جہالت کہا گیا ہے۔ جس میں بے ہودگی پائی جائے۔ جس طرح سورہ القصص میں فرمایا۔

> "اور جب وہ کوئی بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اسے نظر انداز کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ تم سلامت رہو ہم جاہلوں (سے الجھنے) کے خواہاں نہیں ہیں۔"

رحمٰن کے بندوں کی تیسری صفت یہ بیان کی گئی کہ ان کی راتیں اپنے رب کے حضور سجدے اور حالت قیام میں گزرتی ہیں۔ وہ راتوں کو بہت کم سوتے

ہیں۔ کبھی قیام کی حالت میں کبھی رکوع میں اور کبھی سجدے میں اپنی نیاز مندی کا اظہار کرتے ہیں۔ جب دنیا خواب غفلت میں بے خبر سو رہی ہوتی ہے وہ جاگ کر اپنے پروردگار کو یاد کرتے ہیں۔ یہ لوگ جب جنت میں جائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ "یہ اہل جنت وہ لوگ تھے جو راتوں کو کم ہی سوتے تھے اور سحری کے وقت مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔"

شب و روز یاد الٰہی میں بسر کرنے کے باوجود تکبر اور غرور نہیں کرتے۔ عاجزی اور انکسار سے بندگی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ان کی چوتھی صفت بیان کی گئی ہے۔ قرب الٰہی کے باوجود وہ دل میں اللہ کا خوف لیے اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں۔ اور دعا کرتے رہتے ہیں۔ "اے ہمارے رب ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا لے۔ بے شک اس کا عذاب تو بڑا مہلک ہے۔ وہ تو بہت ہی برا ٹھکانہ اور مقام ہے۔"

کیا مقام ہے رحمٰن کے بندوں کا! اور کیا شان پائی ہے مقربین نے!

ایسی ہی برگزیدہ ہستیوں کی صحبت اور راہنمائی سے منزل مقصود حاصل ہوتی ہے۔ ان کی ہم نشینی سے ہی کامیاب زندگی گزارنے کا قرینہ آتا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ رحمٰن کی معرفت رحمٰن کے ان بندوں ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جن کے چلنے پھرنے' اٹھنے بیٹھنے گفتار و کردار کے تذکرے قرآن میں ہوتے ہیں۔ کتنی خوش نصیبی کی بات ہے۔

اللہ ------ الرحمٰن الرحیم نے اپنے بندوں کی پانچویں صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ جب خرچ کرتے ہیں تو میانہ روی اختیار کرتے ہیں۔ نہ وہ فضول خرچ ہوتے ہیں اور نہ کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔ رزق حلال کماتے ہیں پھر اس رزق کی قدر کرتے ہیں اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ رزق حلال کا حق یہ ہے کہ اسے اعتدال کے ساتھ خرچ کیا جائے تاکہ دنیا کی محتاجی سے واسطہ نہ پڑے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ

"جس نے خرچ کرنے میں اعتدال کا طریقہ اختیار کیا وہ کبھی محتاج نہیں ہوگا۔"

حضرت ابو درداؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اپنی معیشت میں اعتدال اختیار کرنا آدمی کے فقیہہ ہونے کی علامتوں میں سے ہے۔"

(مسند احمد و طبرانی)

فضول خرچ شیطان کا بھائی ہوتا ہے اور کنجوس' اللہ کو سخت ناپسند۔ تو ایسی بری خصلتوں کے حامل رحمٰن کے بندے تو نہیں ہو سکتے۔ رحمٰن کے بندے تو فقر کی دستار باندھتے ہیں۔ وہ دنیا کے محتاج نہیں ہوتے۔۔ صرف اللہ کے محتاج ہوتے ہیں۔ جو غنی اور حمید ہے۔

اب اللہ تعالیٰ ان بری عادتوں کا ذکر فرماتا ہے جن سے عباد الرحمٰن دور رہتے ہیں۔ وہ شرک نہیں کرتے۔ ناحق کسی کو قتل نہیں کرتے اور بے حیائی کے ہر کام سے دور رہتے ہیں۔ پھر فرمایا وہ جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے۔ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ وہ سچے ہوتے ہیں اور سچوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ صدق و صفا کے پیکر ہوتے ہیں۔ یہ ان کی چھٹی صفت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔ ساتویں خوبی یہ بتائی کہ جب ان کا گزر کسی لغو کام کے پاس سے ہوتا ہے تو وہ باوقار طریقے سے گزر جاتے ہیں۔ وہاں رکتے نہیں۔ صالحین کی یہ علامت بڑی نمایاں ہوتی ہیں کہ وہ جان بوجھ کر فضول' بے فائدہ اور بری چیزوں کو نہ تو دیکھتے ہیں نہ ان کے بارے میں سنتے ہیں اور نہ ہی ان میں حصہ لیتے ہیں۔ وہ نفاست پسند ہوتے ہیں۔ وہ معاشرتی غلاظتوں اور تعفن کو پسند نہیں کرتے۔

آٹھویں صفت یہ بیان فرمائی کہ جب وہ قرآن کی آیات سنتے ہیں یا تلاوت کرتے ہیں جن میں نصیحت ہوتی ہے تو ان آیات پر اندھے بہرے بن کر نہیں گر پڑتے بلکہ غورو فکر کرتے ہیں۔ ان آیات کے اسرار و رموز سے آگہی حاصل کرتے ہیں۔ کتاب کا علم حاصل کرتے ہیں۔ جب کتاب کا علم حاصل ہو جاتا ہے تو پھر روحانی ارتقاء کی منازل طے ہوتی ہیں۔ روحانی قوت بڑھ جاتی ہے۔ پھر آنکھ جھپکتے اگر بلقیس کا تخت بھی لانا پڑے تو لے آتے ہیں۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ انکو
ید بیضا لئے پھرتے ہیں اپنی آستینوں میں

آخر میں اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کی ایک بہت ہی پیاری عادت کا تذکرہ فرماتا ہے۔ کہ وہ اپنے بیوی بچوں کی طرف ہمیشہ رحمت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے حق میں دعا کرتے رہتے ہیں ان کی دعا یہ ہوتی ہے۔

"اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔ اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔"

اس دعا سے ہمیں اولیاء کرام' صوفیاء عظام اور مقربین کے بارے میں چند باتیں واضح ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ بیوی بچوں والے ہوتے ہیں۔ وہ نیک اور پارسا عورتوں کو اپنے نکاح میں لاتے ہیں۔ ان کی اولاد نیک خصلت اور نیک سیرت ہوتی ہے۔ جن کو دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہتی ہیں اور دل مطمئن رہتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ وہ زندگی کے جھمیلوں سے دور نہیں بھاگتے۔ وہ تارک الدنیا نہیں ہوتے کہ راہبانہ زندگی گزاریں۔ وہ گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ وہ اسی معاشرے میں رہ کر اللہ سے لو لگاتے ہیں۔ ہر ایک کے حقوق پورے کرتے ہوئے بھی اللہ کی یاد سے دل آباد رکھتے ہیں۔

ان کے سامنے معلم انسانیت' رہبر کامل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی حیات طیبہ کا ہر گوشہ منور رہتا ہے۔ وہ سنت سے ہٹ کر کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔

صوفیا کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں یہ جو ایک تصور بیٹھا ہوا ہے کہ صوفی دنیا کے جھمیلوں میں نہیں پڑتا بلکہ وہ تو آبادیوں سے دور جنگلوں پہاڑوں اور بیابانوں میں جاکر اللہ کو یاد کرتا ہے۔ اسے اس دنیا سے کیا کام! اور جو اس معاشرے میں رہ کر محنت مزدوری کرکے رزق حلال کماتا ہے پھر بیوی بچوں رشتہ داروں اور عام مسلمانوں کے حقوق پورے کرتا ہے وہ تو ایک عام مسلمان ہوا۔ صوفی کیسے ہوگیا؟ یہ تصور بالکل غلط ہے اور حقیقت سے بھی دور ہے۔ صوفی ہوتا ہی وہ

ہے جو اسی معاشرے کے اندر رہ کر بندوں کو تمام حقوق پورے کرے اور اللہ کے حقوق کو بھی بطریق احسن بجالائے۔ اور آزمائشوں میں گھر کر اللہ کو یاد رکھے۔ اور دنیا کی آلائشوں سے اپنے دامن کو بچاتا ہوا گزر جائے۔ ایسی زندگی گزارنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ جنگل میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا آسان ہے۔ دنیا میں گھر کر اللہ کو یاد رکھنا بہت مشکل ہے۔ اور یہی نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔

صوفی رزق حلال کماتا ہے۔ محنت مزدوری کرتا ہے۔ بیوی بچوں والا ہوتا ہے۔ والدین، رشتہ داروں، ہمسایوں، یتیموں مسکینوں بیواؤں مسافروں اور دیگر لوگوں کے حقوق پورے کرتا ہے۔ وہ بازار سے سودا سلف بھی خرید کر لے آتا ہے۔ وہ غریبوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ وہ سادہ زندگی بسر کرتا ہے۔ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتا ہے۔ خود تکلیف کاٹ کر دوسروں کے دکھ دور کرتا ہے۔ راحت پہنچاتا ہے انہی گلی محلوں میں چلتا پھرتا ہے۔ عام لباس پہنتا ہے۔ لوگوں میں گھلا ملا رہتا ہے ان تمام باتوں کے باوجود اللہ سے لو لگائے رکھتا ہے۔ دن اللہ کی مخلوق کے ساتھ گزارتا ہے اور رات کی تنہائیوں میں چپکے چپکے اپنے رب سے باتیں کرتا ہے اس وقت وہ اللہ کو بڑا محبوب ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کی مخلوق سے پیار کرتا ہے اور اللہ کو وہ بندے بڑے پیارے لگتے ہیں جو اس کی مخلوق سے محبت کرتے ہیں۔ یہ ہیں صوفی کے شب و روز--- وہ کیسا صوفی ہے جو اللہ کی مخلوق سے دور بھاگے---؟

اسلام نے تقویٰ اور پرہیزگاری کا جو بلند معیار مقرر کیا ہے اسے حاصل کرنے کے لیے عائلی زندگی سے دست بردار ہونا ضروری نہیں۔ جس گھر میں نیک سیرت سلیقہ شعار اور محبت کرنے والی بیوی ہو۔ جہاں خوبصورت تابع فرمان نیک اولاد ہو۔ اس گھر کی فضا اس قابل ہے کہ وہاں کے رہنے والے تقویٰ کی بلندیوں کو چھولیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے کسی حال میں بھی بیوی بچوں کی سنگت کو نہیں چھوڑا۔ ہماری تو ایک دو بیویاں ہوتی ہیں حضورؐ کی تو نو بیویاں تھیں۔ یہاں تک کہ جہاد کے سفر اور عام سفر میں بھی حضورؐ کسی نہ کسی بیوی کو اپنے ساتھ رکھتے۔ قرعہ

اندازی کرتے قرعہ میں جن کا نام نکل آتا۔ امہات المومنینؓ میں سے وہی حضورؐ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کرتیں۔

عباد الرحمٰن کی دعا کا آخری حصہ یہ ہے کہ "اے اللہ ہمیں متقیوں کا امام بنا۔"

یعنی اس دنیا میں رہتے ہوئے اس معاشرے میں گھرے ہوئے بھی ہمیں تقویٰ میں ایسا بلند مقام عطا فرما کہ ہم لوگوں میں نیکی اور پارسائی کا نمونہ بن جائیں۔ لوگ ہمیں دیکھ کر نیکی کی طرف راغب ہو جائیں اور ہدایت پا جائیں۔ ہم دنیا کے جھمیلوں میں رہیں ضرور، مگر ان میں پھنس نہ جائیں ان میں دل نہ لگا بیٹھیں یہ بیوی بچے ہمارے لیے فتنہ نہ بن جائیں۔ یہ ہمیں اللہ کے ذکر سے روک نہ دیں۔ ان سب میں گھر کر بھی تیری یاد کی ڈوری کو مضبوطی سے تھامیں رہیں۔

اے اللہ۔ ہمیں اس قابل بنا دے کہ لوگ ہمیں دیکھ کر تجھے یاد کرنے لگیں۔ جو بھی ہمارا ہم نشین ہو وہ سعادت مند بن جائے-----"

اولیائے کرام کے بارے میں حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ اولیاء اللہ ایسے افراد ہیں کہ ان کا ہم نشین بدبخت نہیں رہتا۔

یہ ہیں عباد الرحمٰن --- جو ہر زمانے میں ہدایت کے روشن چراغ اور نور کے مینار ہیں انہی کی صحبت سے معرفت الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ انہیں یہ مقام یونہی نہیں مل گیا۔ لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت یونہی نہیں بٹھا دی گئی۔ لوگ ان کے آداب کا لحاظ کیوں رکھنے لگے۔؟ ان کی صحبت کو اپنی نجات کا باعث کیوں سمجھنے لگے؟ انہیں دیکھ کر اللہ کیوں یاد آنے لگا؟ وہ اللہ کے محبوب کیوں بن گئے؟ اللہ تعالٰی نے ان کی ایک ایک خوبی کا تذکرہ قرآن میں کیوں کیا؟ وہ اتنے ہی اللہ کو پیارے لگنے لگے تھے کہ کبھی اللہ ان کی چال کی بات کرتا ہے۔ کبھی گفتار کا تذکرہ کرتا ہے۔ کبھی اٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے کو سراہتا ہے؟------- آخر بات کیا ہے؟

بہت بڑی بات ہے میرے دوست! انہوں نے اپنی زندگیاں اپنی مرضی

سے نہیں گزاریں اللہ کی مرضی سے بسر کیں۔ انہیں طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالا گیا۔ انہیں کبھی بھوک دے کر آزمایا کبھی خوف اور جانی و مالی نقصانات دے کر پرکھا گیا۔ دنیا کی لذتوں' رنگینیوں اور آسائشوں کو سامنے رکھ کر جب کہ ان میں کشش اور دلفریبی بھی تھی' ان کے قدموں میں زنجیر ڈال دی گئی۔ حرام مال کا حصول آسان کرکے ان کے ہاتھوں کو باندھ دیا گیا۔ نفسانی خواہشات پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔ وہ ان سب میں اللہ کے فضل و کرم اور رحمت و برکت سے سرخرو ہو کر نکلے۔ اللہ یونہی مقام نہیں دیتا۔ پہلے آزماتا ہے پرکھتا ہے۔ بندے کا حوصلہ دیکھتا ہے پھر ہمت دیتا ہے اور راہ آسان کرتا ہے۔ پھر جا کر نیکی سے محبت پیدا ہوتی ہے' گناہ سے نفرت ہو جاتی ہے اور دلوں میں تقویٰ آجاتا ہے۔

یہی روحانی ارتقاء ہے۔ جو مقام رضا پر پہنچ کر منزل مقصود تک رسائی کا باعث بنتا ہے پھر ایسا شخص متقیوں کا امام بنتا ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں تو کھچے چلے آتے ہیں۔ سراپائے ادب بن جاتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر اللہ یاد آجاتا ہے۔ ان کی صحبت میں سکون ملتا ہے۔ یہ تو دنیا میں ان کی زندگی کی کہانی ہے۔ آخرت میں جنت کی تمام نعمتیں' بالاخانے اللہ تعالیٰ کی میزبانی' تحیت و سلام اور قرب الٰہی۔۔ اس عروج کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تو ایسے ہی برگزیدہ نفوس ہیں جن کی راہنمائی اور صحبت کیمیا ہمیں منزل مقصود تک پہنچا سکتی ہے۔ اور مومن کی منزل ----- اللہ کی ذات ہے --- یہی روحانیت کا عروج ہے۔ جسے معراج انسانیت کہا جاتا ہے۔

نسبت

عباد الرحمٰن سے نسبت جوڑنا روحانی ارتقاء کی بنیاد ہے۔ مرید بیعت کرنے کے بعد جب اپنے شیخ سے منسوب ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کی نظر رحمت میں آجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پھر اس نسبت کا لحاظ رکھتا ہے۔ انسان تو انسان اگر ان کی پیروی میں کتا بھی آجائے تو اس سے بھی اللہ تعالیٰ کو پیار ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے اس کتے کے بیٹھنے کے انداز کو بڑی محبت سے بیان کیا ہے۔

"وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ"

"اور ان کا کتا پھیلائے بیٹھا ہے اپنے دونوں بازو ان کی دہلیز پر۔" (۱۸:۱۸)

کتا ایک نجس جانور ہے۔ لیکن اگر وہ بھی عباد الرحمٰن کے ساتھ وفا شعاری کا طریق اپناتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت میں آجاتا۔ لیکن ایسے انسان تیرا تو مقام ہی بہت بلند ہے۔ تیرے لیے تو یہ ارض و سما بنے۔ ساری کائنات تیرے لیے مسخر کر دی گئی تیرے لیے بھی وفا شعاری ضروری ہے۔ سچوں کے ساتھ نسبت اور سنگت سے ہی بات بنتی ہے۔ پھر ہی گوہر مقصود حاصل ہوتا ہے۔ اس کے مخلص بندوں کا ساتھ دیں گے تو ہدایت پائیں گے ورنہ ہدایت کا نصیب ہونا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا"

"(حقیقت یہ ہے کہ) جسے اللہ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے تو تو اس کے لیے نہیں پائے گا کوئی مددگار (اور) راہنما" (قرآن ۱۸:۱۷)

مرشد کی ذات بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ اس کی راہنمائی ہی میں ہدایت ہے۔ اور جس کی قسمت میں گمراہی ہو اسے تو کوئی مرشد بھی نہیں ملتا۔ اللہ تعالیٰ ایسی بدنصیبی سے بچائے۔

اصحاب کہف کی تعداد کا جب ذکر آیا تو پھر بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے وفا شعار کتے کو شامل کیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"کچھ لوگ کہیں گے کہ (اصحاب کہف) تین تھے چوتھا ان کا کتا۔ اور کچھ کہیں گے کہ وہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا۔ یہ سب تخمینے ہیں بن دیکھے۔ اور کچھ کہیں گے وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا۔"

نسبت کے اس نکتے کو معلم انسانیت ﷺ نے بڑا کھول کر بیان کر دیا ہے۔ فرمان رسالتؐ ہے۔ "جب تم کسی بندے کو دیکھو کہ اسے زہد اور کم گوئی عطا کی گئی ہے۔ تو اس کا قرب حاصل کرو۔ کیونکہ اسے حکمت و دانائی سکھائی اور عطا کی گئی

ہے۔" (بیہقی شریف)

نسبت قائم ہونے کے بعد روحانی ارتقاء بتدریج ہوتا ہے۔ مرشد کی راہنمائی میں جب سالک، سلوک کی منازل طے کرتا ہے اور مقامات سلوک سے گزرتا ہے تو سالک کے قلب پر بعض کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ جن کو اصطلاح تصوف میں "احوال" کہتے ہیں۔ یہی "احوال" اس کی روحانی بلندی اور عروج کا باعث بنتے ہیں "احوال" کی تعداد دس ہے۔ جن کی تشریح درج ذیل ہے۔

۱۔ مراقبہ

مراقبہ کے لغوی معانی سوچنا اور غور و فکر کرنا ہے۔ اصطلاح تصوف میں اس سے مراد یہ ہے کہ سالک کو اس بات کا یقین ہو جائے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس کے جملہ حالات سے باخبر ہے۔ اور ہمیشہ سے اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ جیسا کہ حضورؐ نے احسان کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"ان تعبد الله كانك تراه - فان لم تكن تراه فانه يراك"

"تو اللہ عبادت اس حالت میں بجا لائے کہ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر تو نہیں دیکھ رہا تو بے شک وہ تو تجھے دیکھتا ہی ہے" (صحیح بخاری)

مراقبہ کے تین درجے ہیں:

پہلا درجہ یہ ہے کہ سالک کے دل میں اس یقین کے ذریعے سے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے اندرونی حالات سے باخبر ہے ایسا حال پیدا ہو جائے کہ اس میں وسواس شیطانی کا گزر نہ ہو۔ اور وہ اللہ کو ہر جگہ موجود اور ناظر جان کر خواہشات نفسانی سے باز رہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ سالک کائنات کی طرف سے توجہ ہٹا کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ مبذول کرلے اور دل میں اللہ کے سوا کسی کا خیال نہ لائے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ سالک مراقبہ میں اللہ تعالیٰ سے اس بات کا طلب گار ہو کہ حال مراقبہ میں اللہ تعالیٰ اس کے جملہ امور کی نگہبانی فرمائے۔ اور سالک

اس آیت کا مصداق بنے------

"وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ" (قرآن ۷: ۱۹۶)

"اور وہی صالحین کی نگہبانی کرتا ہے" (تاریخ تصوف در اسلام)

۲۔ قرب

قرب کے لغوی معانی نزدیکی اور رشتہ داری کے ہیں۔ لیکن اصطلاح تصوف میں قرب یہ ہے کہ سالک اس حالت میں اپنے قلب سے اللہ تعالیٰ کی نزدیکی کا مشاہدہ کرے۔ مثلاً

ا "جب میرے بندے آپؐ سے میرے بارے میں پوچھیں تو میں ان کے بالکل قریب ہی ہوں۔ (سورہ البقرہ)

ب "اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔" (سورہ ق)

ج اور ہم تمہارے قریب ہی تو ہیں لیکن تم نہیں دیکھتے۔" (سورہ الواقعہ)

اس حال میں سالک کو چاہیے۔ کہ وہ اطاعت و بندگی سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے۔ اور کائنات کی ہر چیز سے اسے اللہ تعالیٰ کی ذات قریب نظر آئے۔ اور وہ نوافل کی کثرت کرے۔

۳۔ محبت

محبت کے لغوی معنی پیار - چاہت ' مہر اور دوستی کے ہیں۔ اصطلاح تصوف میں محبت اس کشش کا نام ہے۔ جو سالک کے دل میں حسن ازل کے لیے پیدا ہو۔

محبت کے تین درجے ہیں۔

(ا) عام لوگوں کی محبت -------- جو اللہ کے احسان سے ان کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ قلب انسانی فطری طور پر اپنے محسن کی طرف مائل ہوتا ہے۔

(ب) صادقین کی محبت ---------- جو اللہ تعالیٰ کی بے نیازی، جمال فطرت، عظمت اور علم و قدرت کو دیکھ کر ان کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اس محبت کی مثال شیخ ابو الحسن نوریؒ (م ۲۸۶ھ) کے اس قول سے ملتی ہے۔
"پردے ہٹ گئے اور اسرار و رموز منکشف ہو گئے۔"

(ج) صدیقین اور عارفین کی محبت ------- جو ان کی معرفت کامل کا نتیجہ ہے۔ وہ بغیر کسی علت و سبب کے اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ جیسے رابعہ بصریؒ کی محبت - یعنی اللہ سے محبت نہ جنت کے لالچ میں اور نہ دوزخ کے خوف سے محض اسی کی رضا کے لیے۔

ان کی محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ بڑی شدید ہوتی ہے۔ اور یہ لوگ مصداق ہوتے ہیں اس آیت کے --- کہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ "اور جو لوگ ایمان کامل لے آئے ان کی محبت اللہ کے ساتھ بڑی شدید ہے۔(قرآن ۲: ۱۶۵)

حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں "محبت سے مراد ہے صفات محبوب کا صفات محب کے قائم مقام ہو جانا۔ اور محب کا اس قول الٰہی کا مصداق بن جانا کہ --- **حتی احبه - فاذا احببته کنت عینه الذی یبصر به وسمعه الذی یسمع به ویده الذی یبطش به** "یہاں تک کہ میں (اللہ) اس (بندے) سے محبت رکھوں۔ پس جب اس سے محبت رکھتا ہوں تو میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں، جن سے وہ دیکھتا ہے۔ اور اس کے کان، جن سے وہ سنتا ہے۔ اور اس کے ہاتھ جن سے وہ پکڑتا ہے۔" (اسلامی تصوف اور اقبالؒ)

۴۔ خوف

لغت میں خوف کے معنی ہیں۔ ڈر - دہشت، ہراس وغیرہ۔ مگر اصطلاح تصوف میں آنے والے وقت میں کسی ناپسندیدہ یا مکروہ امر کے پیش آنے یا کسی

پسندیدہ یا مستحسن امر کے چھوٹ جانے سے ڈرنا' خوف کہلاتا ہے۔

سالک جس قدر معرفت الٰہی میں عروج حاصل کرتا ہے۔ اسی قدر حال خوف میں شدت پیدا ہونے لگتی ہے۔ جیسا کہ اللہ رب العزت نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔

"اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا"

"اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی (پوری طرح) اس سے ڈرتے ہیں"

(قرآن ۳۵:۲۸)

یعنی جنہیں معرفت الٰہیہ نصیب ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں شریعت و طریقت کے اسرار و رموز سے آگاہ فرمایا ہے۔ وہی ڈرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ناراضی سے کہ ایسا نہ ہو کہ کہیں محبوب حقیقی ناراض ہو جائے۔ وہ ذات جس سے شدید محبت کی جاتی ہے اہل علم اس کی ناراضی کا خوف بھی دل میں رکھتے ہیں۔ محب کو ہمیشہ یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ میرے کسی عمل سے میرا محبوب ناراض نہ ہو جائے۔ اسی کو خوف الٰہی کہتے ہیں اور ایمان بھی محبت اور خوف کے بین بین ہی ہوتا ہے۔ جان عالم' محسن انسانیت ﷺ فرماتے ہیں۔

"اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرِّجَاءَ"

"ایمان خوف اور امید کے مابین ہے" (مشکوٰۃ شریف)

صوفیا کے نزدیک حال خوف اور حال رجاء سالک کے دو پر ہیں جن کے ذریعے وہ قرب الٰہی کے لیے پرواز کرتا ہے۔

سالک کے دل میں خوف الٰہی اللہ کی عظمت میں جلال کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے سالک اپنے آپ کو معصیت سے باز رکھتے ہوئے طاعت الٰہیہ کی طرف راغب ہوتا ہے۔

۵۔ رجاء

رجا کے لغوی معانی امید اور آس کے ہیں۔ لیکن اصطلاح تصوف میں

رجاء اس امنگ کو کہتے ہیں جو سالک کے قلب میں آنے والے زمانہ میں کسی محبوب شے کے حصول کے لیے پیدا ہو۔ اور جو شخص اس کے حصول کا منتظر ہوتا ہے وہی صاحب رجا کہلاتا ہے۔

رجا کے تین درجے ہیں

۱۔ نیک اعمال کے ثواب میں رجاء

۲۔ رحمت الٰہیہ میں رجاء

۳۔ ذات باری تعالٰی میں رجاء

تیسرا درجہ عارفین کا ہے۔ کہ وہ اللہ سے اس کے علاوہ کسی اور چیز کی تمنا نہیں رکھتے۔ صوفیا کے نزدیک وہ عبادت جو اللہ تعالٰی کی رحمت اور اس کے فضل و کرم کی امید پر کی جاتی ہے۔ اس عبادت سے بہتر ہے جو اس کے خوف سے کی جاتی ہے۔ اگر خوف کی زیادتی ہو جائے تو یہ ناامیدی کا باعث بنتا ہے۔ اور راہ طریقت میں یہ بات مذموم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالٰی کی رحمت اس کے جلال سے بہت وسیع ہے۔ پس صراط مستقیم خوف و رجاء کے بین بین ہے۔ اور یہی راہ اعتدال ہے۔

۶۔ شوق

شوق کے لغوی معانی ہیں۔ خواہش، رغبت اور آرزو وغیرہ۔ مگر اصطلاح تصوف میں اس سے مراد یہ ہے کہ سالک کے دل میں اللہ تعالٰی تک پہنچنے کا جوش اور ولولہ پیدا ہو۔ جب تک عرفان حاصل نہیں ہوتا شوق غالب رہتا ہے۔ اور جب معرفت الٰہی حاصل ہو جاتی ہے تو پھر ذوق بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ شوق عام طور پر ان دیکھی چیز کے لیے ہوتا ہے۔ اور کوئی چیز دیکھ لی جائے تو پھر ذوق میں اضافہ ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم خواصؒ جب اس منزل کو طے کر رہے تھے۔ تو ان پر شوق غالب تھا۔ ایک دن آپ نے بڑے جذباتی انداز میں فرمایا

"واہ شوقا! بکسے کہ مرا دید و من او را ندیدم"

واہ اے شوق! وہ ہستی جو مجھے دیکھتی ہے مگر (افسوس) کہ میں اسے

نہیں دیکھتا۔"

۷۔ اطمینان

لغت میں اطمینان کے معنی ہیں۔ تسلی۔ تشفی اور طمانیت۔ لیکن اصطلاح تصوف میں اطمینان اس کیفیت کا نام ہے جو ذکر الٰہی سے سالک کے قلب پر وارد ہوتی ہے۔ اور یہ ایمان کامل کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ خالق حقیقی نے ہمیں پہلے ہی خبردار کر دیا ہے۔

"اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ"

"خبردار! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔"

(قرآن ۱۳: ۲۸)

اس لیے اس حال کو سلوک میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ قرآن حکیم میں ایک دوسری جگہ فرمایا:

"یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً"

"اے نفس مطمئن۔ تو اپنے رب کی طرف اس طرح رجوع کر کہ تو بھی اس سے راضی اور وہ بھی تجھ سے راضی" (قرآن ۸۹: ۲۷: ۲۸)

اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے۔ کہ نفس مطمئنہ سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے۔ اور اطمینان قلب رکھنے والی برگزیدہ ہستی کو مقام رضا حاصل ہوتا ہے۔ اور یہی انسانیت کی معراج ہے۔ کہ رضائے الٰہی حاصل ہو جائے۔ عام سالک کا اطمینان یہ ہے کہ جب وہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو اس کا قلب مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور قلب اطاعت الٰہیہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ جب سالک ذکر کثیر کرتا ہے اور ہر لمحہ یاد الٰہی میں گزارتا ہے تو پھر اسے دائمی اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی مرضی ختم کر کے اللہ کی مرضی پر چل پڑتا ہے۔ وہ قضائے الٰہی پر راضی و مطمئن ہو جاتا ہے۔ راحت ہو یا آلام و مصائب اس کے لیے برابر ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ بھی ہے وہ منجانب اللہ ہے۔ جب یہ کیفیت ہوتی ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی معیت

حاصل ہوتی ہے۔ اللہ کا قرب اور اس کا ساتھ نصیب ہوتا ہے۔ اور یہی متقین اور محسنین کا مقام ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے۔

"اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِیْنَ ھُمْ مُحْسِنُوْنَ" (قرآن ۱۶: ۱۲۸)

"بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو متقی اور محسن ہیں"

جب سالک کو اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے تو وہ اس وقت مقام توکل پر ہوتا ہے۔ اس وقت بندہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حال میں اس کی بہتری چاہنے والا ہے۔ اور وہ نعم الوکیل اور نعم النصیر ہے۔

۸۔ اُنس

انس، رغبت اور محبت کے مترادف ایک ایسی لطیف اور غیر محسوس کشش کا نام ہے۔ جو اپنی پسندیدہ ہستی کی طرف ہوجاتی ہے۔ اصطلاح تصوف میں انس کا مفہوم یہ ہے کہ جب سالک کے قلب پر اللہ تعالیٰ شہود جمال کی تجلی ڈالتا ہے تو سالک کا دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے مانوس ہو جاتا ہے۔ اور وہ جمال الٰہی سے خوش ہو کر نفس مطمئنہ کے اندر ایک لطیف محبت کے تحت اللہ تعالیٰ کا قرب محسوس کرتا ہے۔

حضرت علی بن عثمان الہجویری رحمۃ اللہ علیہ کشف المحجوب میں فرماتے ہیں۔

"انس کا غلبہ راز کے ساتھ ہوتا ہے۔ معرفت الٰہی کی وجہ سے جمال کی تجلی اس راز کو باقی رکھتی ہے۔ یاد رکھو جو لوگ اہل فنا ہوتے ہیں وہ ہیبت کو مقدم جانتے ہیں اور جو اہل بقا ہوتے ہیں وہ انس کو فضیلت دیتے ہیں۔"

مشائخ کا ایک گروہ کہتا ہے کہ انس تو جنس سے ہو سکتا ہے۔ جب بندہ اللہ کا ہم جنس اور ہم شکل نہیں تو پھر اس کا انس کیسے صورت پذیر ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا بندے سے مانوس ہونا بھی مشکل امر ہے۔ اس طرح اگر انس ممکن ہو سکتا ہے تو صرف اللہ کی یاد کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔"

اس حال میں سالک کو چاہیے کہ وہ اللہ کی یاد سے اپنے قلب کو تروتازہ

رکھے بلکہ اس میں کثرت پیدا کرے۔ کیونکہ نفس مطمئنہ کو غیر کے ذکر سے بچانا بھی ضروری ہوتا ہے اور یہ کام انس کرتا ہے۔ اس کے بعد اسے حقائق کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے جو حقیقت کی ابتداء ہے اور معرفت الٰہی کی نوید۔

۹۔ مشاہدہ

مشاہدہ کے لغوی معانی دیکھنا یا معائنہ کرنا کے ہیں۔ اور اصطلاح تصوف میں مشاہدہ سے مراد "دل کی آنکھ سے دیکھنا ہے۔" سالک کا قلب جب ذکر الٰہی سے مطمئن ہو جاتا ہے تو اس پر سے معصیت اور افکار فاسدہ کا زنگ اتر جاتا ہے۔ ظلمت کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں اور اس میں اللہ کا نور بھر جاتا ہے۔ وہ صاحب بصیرت بن جاتا ہے۔ اس کی فراست وسیع ہو جاتی ہے۔ حجابات دور ہونے لگتے ہیں۔ اسرار و رموز الٰہی منکشف ہونے لگتے ہیں۔ اس کی باطنی آنکھ روشن ہو جاتی ہے۔ اور وہ اللہ کے نور سے دیکھنے لگتا ہے۔ اور وہ اس ارشاد کا مظہر بن جاتا ہے کہ -------

"مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"

اس حال میں سالک مقام احسان پر ہوتا ہے---- کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرئے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے ورنہ وہ تو تجھے دیکھتا ہی ہے۔"

حضرت علی المرتضیٰؓ نے ایک بار فرمایا

"لا اعبد ربا لم اراہ"

"میں اس رب کی عبادت نہیں کرتا جسکو میں نہیں دیکھتا" (تاریخ تصوف در اسلام)

یہی احسان (تصوف) ہے صوفیاء کرام ان چیزوں کا مشاہدہ کر رہے ہوتے ہیں جن کو یہ ظاہری آنکھ نہیں دیکھ رہی ہوتی۔ یہی روحانی ارتقاء کا عروج ہے ایک بار نبی کریم ﷺ نے حضرت حارثہ بن سراقہ انصاریؓ سے پوچھا۔ حارثہؓ اس وقت تیرا کیا حال ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔ "یارسول اللہ ﷺ

میرے ماں باپ آپؐ پر قربان۔ عین اس وقت میری یہ حالت ہے کہ خود کو عرش کی جانب پرواز کرتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ جنت اور دوزخ میرے سامنے ہیں اور میں

لوگوں کو گروہ در گروہ ان میں داخل ہوتے دیکھ رہا ہوں۔"

یہ ہے مشاہدہ ---- جسے باطنی آنکھ دیکھتی ہے۔ اور یہی روحانی عروج ہے۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ جب میرا بندہ میری طرف رجوع کرتا ہے .... "تو میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں وہ مجھ سے دیکھتا ہے۔"

"اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے" (قرآن ۲۴: ۳۵)

اور اللہ کے نور سے کائنات کا ذرہ ذرہ جگمگا رہا ہے۔ اور وہ نور ہر جگہ موجود ہے۔ اور یہی نور الٰہی سالک کے قلب پر چمکتا ہے۔ اور وہ دل کی آنکھ سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کے سامنے سے حجابات ہٹ جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اسی "حال" سے گزرنے کے لیے دعا کی تھی۔

خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نور بصیرت عام کر دے

۱۰۔ یقین

یقین خاتم الاحوال ہے۔ اس کے لغوی معانی یہ ہیں کہ وہ علم جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اصطلاح تصوف میں یقین کا مطلب ہے۔ کہ کسی پوشیدہ چیز کو قوت ایمانی سے بعینہ صحیح طور پر دیکھ لینا۔ اور اس کے لیے کسی دلیل اور حجت کی ضرورت محسوس نہ کرنا یعنی ----- رویت عیاں بقوت ایمان نہ بحجت و برہان۔ (تاریخ تصوف در اسلام)

قرآن حکیم نے یقین کے تین درجے بیان کئے ہیں۔

۱۔ علم الیقین ۲۔ عین الیقین ۳۔ حق الیقین

حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ نے ان کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے۔ کہ علم الیقین کا مطلب دنیاوی معاملات کو ان کے احکام کے ساتھ جاننا۔ اور عین

الیقین کا مطلب حالت نزع اور وقت رحلت کا علم ہے اور حق الیقین سے مراد جنت میں اللہ کے ظاہر ہونے اور اس کے احوال اور کیفیت کو دیکھنا ہے۔

علم الیقین علماء کا درجہ ہے۔ اس لحاظ سے کہ وہ احکام امور پر ثابت قدم ہوتے ہیں۔ عین الیقین عارفوں کا درجہ ہے۔ اس لحاظ سے کہ وہ موت کے لیے بالکل مستعد ہوتے ہیں۔ اور حق الیقین محبان حق کی فنا کا درجہ ہے کہ وہ اس لحاظ سے کل موجودات سے اعراض کیے ہوتے ہیں۔ اس لیے علم الیقین مجاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ عین الیقین محبت الٰہی سے اور حق الیقین مشاہدہ حق سے۔" (کشف المحجوب (باب دہم)

یہ دس احوال ہیں جو سالک کو راہ طریقت میں پیش آتے ہیں۔ جب وہ مرشد کی راہبری میں مقامات سلوک سے گزرتا ہے۔ تو بالآخر منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ اور یہ درجہ "فنافی اللہ" کا ہے۔

فنافی اللہ

شریعت و طریقت میں "فنافی اللہ" سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنی ذات کے ناقص ہونے کا مکمل احساس پیدا کرلے۔ اس کی کوئی خواہش باقی نہ رہے وہ مکمل طور پر اپنی نفی کردے۔ اور وہ اپنے آپ کو ہر لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

"کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ○ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ○"

"ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ اور صرف (اے رسولؐ آپؐ کے) رب کی ذات کے لیے بقا ہے جو جلال و اکرام والا ہے" (قرآن ۵۵: ۲۶، ۲۷)

بعض لوگوں نے فنا کا مطلب کچھ اور لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فنا کا مطلب فقدان ذات اور ازالہ شخصیت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی بقا میں پیوست ہو جانے کو بقا کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ ناممکن ہے۔ اس عقیدہ کی وضاحت حضرت علی بن عثمان ہجویری

رحمۃ اللہ علیہ نے کشف المحجوب میں بڑے پیارے انداز میں کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

"نصاریٰ کا مذہب یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام بزور مجاہدہ تمام ناسوتی اوصاف سے فانی ہو گئیں ان کو بقائے لاہوتی حاصل ہوئی اور اس بقا سے بقائے خداوندی میں شامل ہو گئیں۔ اس کا نتیجہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ جن کی ترکیب اصلیت انسانیت سے بالاتر تھی۔ کیونکہ ان کی بقا درحقیقت بقائے الہیت سے پیوستہ تھی۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کی والدہ اور حق تعالیٰ ایک ہی قسم کی بقا میں شامل تھے۔ یعنی بقائے قدیم میں جو صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے------ اس عقیدہ کو سامنے رکھتے ہوئے پھر ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ مخلوق اور خالق قدیم میں کوئی فرق نہیں۔ یا پھر یہ کہنا پڑے گا کہ خالق کا مخلوق سے ملاپ ہے۔ یا خالق مخلوق میں حلول کرتا ہے۔ یہ صریح گمراہی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جو چیزیں ایک دوسرے سے پیوست، ملی جلی اور قریب ہوتی ہیں وہ باہم یکساں ہوتی ہیں۔ اور خالق و مخلوق کو اس تصور میں دیکھنا صریح گمراہی ہے۔ آگ اگر کسی چیز کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے تو یہ آگ اس چیز کا وصف تو بدل سکتی ہے مگر اس کی ذات نہیں بدل سکتی۔ اگر لوہا آگ میں گرتا ہے تو آگ کا تصرف لوہے کے وصف کو تو بدل دے گا۔ مگر اس کی ذات نہیں بدلتی یعنی لوہا کبھی آگ نہیں ہو سکتا۔" (کشف المحجوب)

حقیقت میں فنا سے مراد فنائے ذکر غیر ہے۔ اور بقا سے مراد بقائے ذکر الٰہی ہے۔ تمام معبودان باطلہ جن میں ہوائے نفسانی بھی شامل ہے کی نفی کر دینا۔ اور صرف حق تعالیٰ کی رضا کا طالب ہونا---- فنا فی اللہ ہے۔ جب سالک یہ کہتا ہے کہ اللہ ہی میرا رب ہے۔ وہی میرا معبود ہے۔ تو پھر وہ اپنے آپ کو احکام الٰہی کے سامنے مغلوب پاتا ہے۔ اور مغلوب ہمیشہ غالب کے سامنے فانی ہوتا ہے۔ وہ اپنی فنا کو دیکھ کر عاجزی اختیار کرتا ہے۔ اللہ وحدہ لاشریک کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ اور بالآخر مقام رضا پر پہنچ کر رضائے الٰہی حاصل کر لیتا ہے۔ اور یہی فنا فی اللہ ہے اور اسی کو بقا باللہ کہتے ہیں اس طرح اپنی مرضی ختم ہو جاتی ہے اور اللہ کی مرضی باقی رہ جاتی

ہے۔ فنا کا مطلب ہر گز فنائے ذات نہیں۔

پس سالک اسی طرح منازل سلوک طے کرتا ہوا منزل مقصود حاصل کر لیتا ہے۔ یہ طویل سفر مقام توبہ سے شروع ہوتا ہے اور مقام رضا پر اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے اس مقرب بندے سے فرماتا ہے۔

"یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ○ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ○ "

"اے نفس مطمئنہ! تو اپنے رب کی طرف اس حال میں رجوع کر کہ تو بھی اس سے راضی اور وہ بھی تجھ سے راضی۔ پس شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔" (قرآن ۸۹: ۲۷: ۳۱)

یہ خوشخبری کب ملتی ہے؟ ----- جب بندہ ماسواء کو دل سے نکال کر صرف اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل روشن کرلے۔ اپنی مرضی ختم کرکے اپنے آپ کو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع کرلے اور اپنے تمام امور اللہ تعالیٰ کی سپرداری میں دے دے۔ پھر سب بت ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور دل سے آواز آتی ہے۔ "بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے------ پس یہی فنا فی اللہ ہے۔

(د) حقیقت خوارق و کرامات

کرامت خرق عادت ہے۔ جو شریعت کے دائرے میں رہ کر ولی کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ معجزہ نبوت کی دلیل ہے مگر کرامت ولایت کی دلیل نہیں ہے۔ اگر کسی ولی کے ہاتھوں کبھی کوئی کرامت (مافوق الفطرت بات) ظاہر نہ ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ صاحب ولایت نہیں۔ کوئی نبی ایسا نہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے واضح نشانیاں دے کر نہیں بھیجا۔ نبی معجزات کے ساتھ اثبات نبوت کرتا ہے۔ ولی کی کرامت نبی کے معجزہ کے تابع ہوتی ہے۔ بعض اوقات حق تعالیٰ اپنے بندے کے ہاتھوں ایسے امور سرانجام دیتا ہے۔ جن کا ہونا دوسروں کے لیے ہدایت کا باعث بنتا

ہے۔ اور جو ہدایت پر ہوتے ہیں ان کا ایمان قوت پکڑتا ہے۔

کرامت اللہ کے مطیع و فرمانبردار بندے ہی سے معرض ظہور میں آتی ہے۔ اگر کوئی آدمی اطاعت الٰہی سے باہر ہو اور وہ حیران کن امور سرانجام دے تو وہ کرامت نہیں ہوگی بلکہ وہ اپنی استدراجی قوت کے ساتھ شعبدہ بازی کر رہا ہوگا۔ ولی چونکہ نبی کی دعوت ہی کا پرچار کر رہا ہوتا ہے اور وہ شریعت ہی کی سیدھی راہ پر ہوتا ہے اس لیے نبی کی متابعت میں ولی کے ہاتھوں کرامات کا ظہور کوئی عجیب بات نہیں۔ چونکہ نبوت کے بعد ولایت کے ذریعے دین کی تبلیغ و ترویج ہوتی ہے۔ اس لیے کرامت کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کرامت صرف قوی ایمان والے ہی کے ہاتھوں رونما ہوتی ہے۔

قرآن حکیم میں جہاں انبیاء کرام کے معجزات کا تفصیلی ذکر ہے وہاں کرامات اولیاء کا بھی بیان ہے۔ اور یہی کرامات کے حق ہونے کی دلیل ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ جب زکریا علیہ السلام حضرت مریمؑ کے پاس آتے تو ان کے پاس ایسے پھل دیکھتے جن کا موسم نہیں ہوتا تھا۔ پوچھتے ہیں۔

"يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ"

"اے مریم! یہ تیرے لیے کہاں سے آیا؟ وہ کہتیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے" (قرآن ۳: ۳۷)

یہ بات تو واضح ہے کہ حضرت مریمؑ، پیغمبر تو نہیں تھیں۔ اس لیے بے موسم پھلوں کا آنا معجزہ نہیں بلکہ کرامت تھی۔ جو ایک ولیہ کے ہاتھوں رونما ہوتی تھی۔

اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب بلقیس کا تخت منگوانا چاہا تو اپنے درباریوں سے فرمایا کہ تم میں سے کون بلقیس کے تخت کو اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے لا سکتا ہے۔ تو جنات میں سے ایک جن نے اپنی خدمات پیش کیں کہ دربار برخاست کرنے سے پہلے پہلے لے آتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جنات کے پاس ایسی طاقت

اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہے۔ مگر صاحب کرامت ولی اللہ کی طاقت جنات سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ سن کر آپ کے دربار میں موجود اللہ تعالیٰ کے ایک ولی نے عرض کیا۔

"قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ"

"عرض کی اس نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا۔ (اجازت ہو تو) میں لے آتا ہوں اسے آپ کے پاس اس سے پہلے کہ آپ کی آنکھ جھپکے۔ پھر جب آپ نے اسے دیکھا کہ رکھا ہوا ہے آپ کے نزدیک تو فرمانے لگے۔ یہ میرے رب کا فضل و کرم ہے۔" (قرآن ۲۷:۴۰)

قرآن کی مذکورہ آیت کرامت اولیاء اللہ کے برحق ہونے کا بین ثبوت ہے۔ اس ایک آیت میں بہت سے اسرار و رموز پوشیدہ ہیں۔ پہلی بات اس سے یہ ثابت ہوئی کہ ولی وہ ہوتا ہے جس کو کتاب الٰہی کا علم حاصل ہو۔ یعنی بے علم اور جاہل آدمی مقام ولایت پر فائز نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ اولیاء اللہ کو جو طاقت اور تصرف حق تعالیٰ نے دیا ہے وہ اس قوت اور تصرف سے بڑھ کر ہے جو جنات کو دیا گیا ہے۔ تیسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ کرامت کا ہونا فضل الٰہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی توجہ اور نظر عنایت کی بدولت ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس کرامت کو دیکھ کر برآشفتہ نہیں ہوئے نہ انکار کیا اور نہ اس چیز کو محال سمجھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبی نے ولی کی کرامت کی تصدیق کر دی۔

یہ ولی اللہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے امتی تھے۔ اس معیار کو سامنے رکھتے ہوئے اگر آپ یہ اندازہ لگائیں کہ نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے امت سے جو ولی اللہ ہیں ان کا کیا مقام ہوگا اور ان کی طاقت اور تصرف کا کیا عالم ہوگا تو پھر پتہ چلتا ہے کہ مقام ولایت کیا ہے اور کرامت کا ظہور کیونکر ہوتا ہے۔

حضور نبی رحمت ﷺ کے عہد مبارک میں جب کہ حضورؐ کے ہاتھوں معجزات ظہور پذیر تھے' صحابہ کرامؓ اور صحابیاتؓ سے بھی بہت سی کرامات کا ظہور ہوا۔ جن کی تفصیل کی اس کتاب میں گنجائش نہیں۔

صحابہ کرامؓ کے بعد صوفیاء عظامؒ اور اولیائے کے ہاتھوں بے شمار کرامات معرض ظہور میں آئیں۔ اور تاحال خوارق و کرامات دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ اور قیامت تک ایسا ہوتا رہے گا۔ کیونکہ امت میں ایک جماعت ہمیشہ موجود رہے گی جو نیکی کا حکم دیتی رہے گی اور برائی سے منع کرتی رہے گی۔ اور وہ جماعت صوفیائے کرام کی برگزیدہ جماعت ہی ہے۔

کرامت صرف یہ ہی نہیں کہ کوئی مافوق الفطرت بات کا ہو جانا یا حیرت انگیز کام کر دکھانا بلکہ اصل میں کرامت کی حقیقت یہ ہے کہ اپنی زندگی کو سنت نبویؐ کے مطابق ڈھال کر رضائے الٰہی حاصل کی جائے اور جو بھی یہ باہمت کام کرلے گا وہ صاحب کرامت ولی اللہ ہوگا۔

(ر) روحانی امراض اور ان کا علاج

انسان دو چیزوں کا مرکب ہے۔ ایک جسم دوسری روح۔ جس طرح مختلف امراض انسانی جسم پر حملہ آور ہوتے ہیں اسی طرح بہت سے امراض انسانی روح کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ جسمانی معالج' حکیم اور ڈاکٹر ہیں بعینہ روحانی معالج اولیاء اللہ ہوتے ہیں۔ جس طرح جسم کی بیماری دور کرنے کے لیے کسی مستند ڈاکٹر یا حکیم سے باقاعدہ علاج کرانا پڑتا ہے۔ اور معالج کی تجویز کردہ ادویات کھانا پڑتی ہیں اور جو پرہیز وہ بتائے وہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح مرشد کامل بھی جب اپنے مرید کی روحانی اصلاح کرتا ہے تو وہ کچھ ادویات بتاتا ہے اور پرہیز کراتا ہے۔ اور پرہیز علاج سے بہتر ہوتا ہے۔ روح کا مسکن خاص قلب انسانی ہے۔ جو فواد یعنی دل کے اندر ہے۔ جیسا کہ منافقین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

"فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا"

"ان کے دلوں میں (پہلے ہی کفر کا) مرض تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے (ان کی خباثت نفاق کی وجہ سے) ان کے مرض کو اور بڑھا دیا" (قرآن ۲: ۱۰)

روحانی امراض قلب میں پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی بہت سے اقسام ہیں۔ لیکن ان میں کفر، شرک، نفاق، تکبر، شح نفس، بغض، حسد، کینہ، غیبت، تعصب، فسق وفجور، ظلم، بخل، بد خلقی، بد ظنی، بے حیائی، دروغ گوئی، خیانت، وعدہ خلافی، جہالت، خود غرضی، حرص، ریاکاری، بے ادبی اور کاہلی وغیرہ زیادہ مہلک ہیں۔

چونکہ یہ تمام روحانی بیماریاں قلب میں پیدا ہوتی ہیں اس لیے روحانی معالج (مرشد کامل) ان بیماریوں کو ختم کرنے کے لیے قلب انسانی کی اصلاح کرتا ہے اور نسخہ تجویز کرتا ہے۔ جیسا کہ اس کی نشاندہی قرآن حکیم نے فرمائی ہے۔

"فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ"

"حقیقت تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل (قلوب) اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں" (قرآن ۲۲: ۴۶)

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ **شر العمی عمی القلب** "دل کا اندھا ہونا سب سے برا اندھا پن ہے۔"

ایک دوسری جگہ قرآن حکیم نے نشاندہی فرمائی۔

"بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" (قرآن ۸۳: ۱۴)

"بلکہ جو کرتوت وہ کیا کرتے تھے ان کا میل ان کے قلوب پر جم گیا ہے۔"

نبی رحمت ﷺ نے فرمایا۔ "خبردار تمہارے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب درست ہو گیا تو سارا بدن سدھر گیا۔ اور جب یہ بگڑ گیا تو سارا بدن بگڑ گیا۔ جان لو کہ یہ قلب (دل) ہے۔" (صحیح بخاری و مسلم)

قلب، انسانی افکار و خیالات، جذبات و احساسات اور تمام حرکات وسکنات کا مرکز و محور ہے۔ پہلے قلب میں ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر انسان اس ارادے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس لیے اعمال کا دارومدار نیت قلب پر ہے۔ قلب کی

اصلاح انسانی اعضاء کی درستی سے زیادہ مقدم ہے۔ کیونکہ بدن' انسانی قلب کے تابع ہے۔ دل کی اصلاح ہو گئی تو اعمال خود بخود صحیح ہو جائیں گے۔ اس لیے مرشد کامل سب سے پہلے مرید کے قلب کی اصلاح کرتا ہے۔ اور ذکر الٰہی کے ذریعے قلب کا زنگ اتارتا ہے۔

جب روحانی امراض قلب انسانی کو گھیر لیتے ہیں تو انسان نفس امارہ کا بندہ بن جاتا ہے وہ اپنی خواہشات کا تابع ہو جاتا ہے۔ شیطان اس کی رگوں میں خون کی طرح دوڑنے لگتا ہے۔ قلب کے اندر جذبات برانگیختہ ہونے لگتے ہیں۔ وہ اپنے دل میں گھٹن محسوس کرتا ہے۔ اس کا دل جکڑ لیا جاتا ہے۔ جب وہ سرکشی' فسق و فجور اور ظلم میں آگے بڑھ جاتا ہے تو اس کے نزدیک گناہ گناہ نہیں رہتا۔ نیکی بدی کا احساس اس کے قلب سے ختم ہو جاتا ہے۔ وہ گناہ کر کے اس طرح اتراتا ہے جس طرح کوئی نیکی کا کام کر کے خوش ہوتا ہے۔ اسے معصیت میں کشش اور گناہ میں لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور وہ فسق و فجور کی دلدل میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ اس کا نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے روحانی مریض کے بارے میں حق تعالیٰ نے فرمایا۔

"فَوَيْلٌ لِّلْقَسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اُوْلٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ"

"پس ہلاکت ہے ان سخت دلوں کے لیے جو ذکر الٰہی سے متاثر نہیں ہوتے۔ یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔" (قرآن ۳۹: ۲۲)

ایسے مریضوں کی جب اصلاح ہوتی ہے کہ تو سب سے پہلے وہ روحانی توجہ سے نوازے جاتے ہیں۔ یہ روحانی توجہ کیا ہے؟ یہ اللہ کا نور ہے۔ جو ولی اللہ کے قلب سے اس کی نگاہوں میں آتا ہے۔ اور یہ نظر عنایت جس پر ہو جائے۔ اس کے دل کی سختی ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ اللہ کے ذکر کی طرف توجہ کرتا ہے۔ اسے توبہ کی توفیق ملتی ہے اور جب وہ روبہ اصلاح ہوتا ہے۔ تو بارگاہ رب العزت کی طرف سے خصوصی عنایت ہوتی ہے۔ اور اسے ذکر کی برکت سے راہ ہدایت ملتی ہے۔

"وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ○ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ○ "

"اور راہنمائی فرماتا ہے (اللہ تعالیٰ) اپنی طرف جو صدق دل سے رجوع کرتا ہے (یعنی) جو لوگ ایمان لائے اور مطمئن ہوتے ہیں جن کے دل ذکر الٰہی سے۔ دھیان کرو کہ اللہ کی یاد سے ہی دل مطمئن ہوتے ہیں۔"

(قرآن ۱۳: ۲۷، ۲۸)

یہ رجوع الی اللہ اپنے آپ نہیں ہوتا بلکہ روحانی مریض کو جب مسلسل روحانی دوا اور غذا (ذکرالٰہی) دی جاتی ہے تو مریض شفایاب ہونے لگتا ہے۔ روحانی معالج اس کے روحانی مرض کو دیکھ کر اس کے مطابق اسکا نسخہ تجویز کرتا ہے۔ اور دوران علاج (روحانی تربیت میں) اس کے مرض کے مطابق ہی پرہیز کراتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے دل سے وہ مرض دور ہو جاتا ہے۔ اور اس کے منفی جذبات مثبت حالت میں آجاتے ہیں۔ اس کی سوچ اور فکر بدل جاتی ہے۔ اور اس کا اثر اس کے اعضاء پر پڑتا ہے اس طرح وہ نیک اعمال کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔

"ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ"

"پھر نرم ہو جاتے ہیں ان کے بدن اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف۔"

(قرآن ۳۹: ۲۳)

اور ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

"اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ"

"جب ذکر کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا تو کانپ اٹھتے ہیں ان کے دل۔ اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر اللہ کی آیتیں تو یہ ان کے ایمان کو بڑھا دیتی ہیں۔ اور وہ صرف اپنے رب پر توکل رکھتے ہیں۔" (۸: ۲)

کوئی بھی دوا حکیم یا ڈاکٹر کے مشورہ کے بغیر کھائی جائے تو وہ فائدے کی

بجائے نقصان بھی دے سکتی ہے۔ اس لیے روحانی امراض کے علاج کے لیے ذکر الٰہی جو اکثیر کا درجہ رکھتا ہے مرشد کامل کے مشورے اور ہدایت کے بغیر موثر نہیں ہو گا۔ شیطان جو انسان کو گمراہ کرنے کے لیے گھات لگائے بیٹھا ہے وہ دوران ذکر الٰہی بھی انسان کو گمراہ کر سکتا ہے۔ بجز اس شخص کے جو کسی راہنما کی تربیت میں آگیا ہو۔ بڑی بڑی روحانی بیماریاں ایسی ہیں جو شیطان اور نفس امارہ کی وساطت سے اس طرح قلب میں گھس جاتی ہیں کہ انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ عبادت گزار ہوتے ہوئے بھی انسان متکبر' ریاکار' حاسد' بد خلق' متعصب' خائن' دروغ گو' خود غرض' حریص اور بے ادب ہو سکتا ہے۔ یہ بیماریاں قلب کو دیمک کی طرح چاٹتی رہتی ہیں۔ اور شیطان اسے ایسے نشے میں رکھتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو برگزیدہ عبادت گزار ہی سمجھتا رہتا ہے۔ کیونکہ بغیر مرشد کے وہ ان بیماریوں سے آگہی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کو بتانے والا اور احساس دلانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اسی لیے حضورؐ نے فرمایا تھا۔ **الشیطان مع الواحد وھو من الاثنین ابعد** شیطان تنہا آدمی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور دو سے دور رہتا ہے۔"

مولانا رومؒ نے بھی مثنوی میں اس خطرے سے آگاہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

ہر کہ او بے مرشدی در راہ شد او زغولان گمرہ و در چاہ شد

گر نباشد سایہ پیر اے فضول' پس ترا سرگشتہ دارد بانگ غول

"جو آدمی بغیر مرشد کے اس راستے پر چلا ہے وہ شیاطین کے ہاتھوں گمراہ ہوا اور (گمراہی کے) کنویں میں جا گرا۔ اے کم عقل۔ اگر مرشد کا سایہ تجھ پر نہیں تو شیاطین کی آوازیں تجھے گمراہ کر دیں گی۔"

لہٰذا اپنا روحانی علاج خود نہ کیجئے۔ کسی مستند روحانی معالج کے پاس جائیے۔ وہی دوا دے گا اور پرہیز بھی بتائے گا۔ اپنی مرضی سے نسخہ استعمال کریں گے تو نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات ذہن نشین کر لیجے کہ روحانی امراض کے علاج میں پرہیز' دوا سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

روحانی امراض میں اللہ کی عبادت دوا کی جگہ ہے اور گناہوں سے بچنا اس کا پرہیز ہے۔ ہم عبادت تو کرتے جاتے ہیں مگر گناہوں سے پرہیز نہیں کرتے۔ اس طرح دوا بے اثر ہو جاتی ہے۔ اور مرض ختم ہونے کی بجائے اور بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص نماز تو پڑھے مگر حرام سے نہ بچے تو نماز اپنا اثر نہیں کرے گی۔

(ز) زیارت قبور

انسان ایک مقررہ وقت تک کے لیے اس دنیا میں آتا ہے۔ اس کے بعد موت اس دنیاوی زندگی کے ساتھ اس کا تعلق منقطع کر دیتی ہے۔ جتنا عرصہ وہ دنیا میں رہتا ہے وہ اپنے عقیدے کے مطابق اعمال سرانجام دیتا ہے۔ اگر اس کا عقیدہ صحیح ہے تو اس سے اعمال صالحہ وقوع پذیر ہوں گے بصورت دیگر اعمال قبیحہ سرزد ہوں گے۔ اسلام نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اے انسان نہ اللہ نے تجھے بے کار پیدا کیا ہے اور نہ یہ کائنات فضول پیدا کی ہے۔ تیری پیدائش کا بھی ایک مقصد ہے اور اس کائنات کو تخلیق کرنے کا بھی ایک جواز ہے۔ اور اے انسان یاد رکھ! یہ وسیع و عریض کائنات اور جو کچھ اس میں ہے یہ صرف تیرے لیے بنائی گئی ہے لیکن تجھے خالق حقیقی نے صرف اپنے لیے پیدا کیا ہے۔ تو کتنا خوش نصیب ہے کہ اس نے تیرے ساتھ اپنی نسبت کو رکھا۔۔۔ "میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔" ۔۔۔۔۔ لیکن اے انسان! اکثریت نے مجھے فراموش کر دیا۔ اور اس فانی دنیا کی چند روزہ زندگی کے حسن میں کھو گئے۔ لیکن جنہوں نے میری نسبت کا خیال رکھا۔ میں نے اس دنیا میں بھی انہیں عزت و توقیر بخشی اور آخرت میں بھی انہیں بے حساب انعام و اکرام سے نوازا۔ اور جنت کی نہ ختم ہونے والی نعمتوں کا مالک بنا دیا۔ نہ انہیں اس دنیا میں خوف ہے اور نہ انہیں آخرت کا غم ہے۔ میں نے انہیں اس دنیا میں بھی بھلائی دی اور آخرت کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں۔

"لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِیْنَ ○ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ كَذٰلِكَ يَجْزِى اللّٰهُ الْمُتَّقِينَ"

"جنہوں نے (اس دنیا میں) اچھے کام کیے۔ ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے۔ اور آخرت کا گھر بھی (ان کے لیے) بہت بہتر ہے۔ اور بہت ہی عمدہ ہے پرہیزگاروں کا گھر۔ (ان کے لیے) ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے۔ رواں ہوں گی ان کے نیچے نہریں۔ ان کے لیے وہاں ہر وہ چیز ہو گی جس کی وہ خواہش کریں گے۔ یوں بدلہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو" (قرآن ۱۶: ۳۰،۳۱)

یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے ساتھ اپنی نسبت کا خیال رکھا۔ اور دنیاوی زندگی میں خواہ کتنے ہی مصائب آئے وہ خندہ پیشانی سے انہیں جھیلتے رہے۔ صبرو شکر کرتے رہے اور صرف اس کی رضا و خوشنودی کے خواہاں رہے۔ کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی کمال صبر و استقامت دکھا کر کامیاب اور کامران ہوئے۔ انہوں نے ایک دفعہ کہہ دیا کہ اللہ ان کا رب ہے بس پھر ساری زندگی اس عقیدہ پر پختہ رہے۔ دنیا خواب غفلت میں سو رہی ہوتی تو وہ راتوں کو اٹھ کر اپنے رب کے حضور کھڑے ہو جاتے اور نہایت عجزو انکسار کے ساتھ عرض کرتے۔

"رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْم - وَ تُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْم"

آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے۔ دن نکلتا تو دنیا کی آلائشوں سے دامن بچا کر نکل جاتے۔ پس جنہوں نے نسبت کو قائم رکھا اور ہر حال میں اپنے رب کو یاد رکھا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ان سے زیادہ یاد رکھا۔ جب وعدہ آگیا اور یہ چند روزہ زندگی اپنے اختتام کو پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے قاصد بھیجے۔ کہ جاؤ میری نسبت کو قائم رکھنے والے میرے بندے کے پاس اور اسے میرا سلام پہنچاؤ۔ اور کہہ دو کہ اے میرے بندے۔ اب آ میری طرف کہ میں تجھے اپنے پاس جگہ دوں۔ قاصد آتے ہیں۔ اور آسمان کے فرشتے اس مقدس روح کے استقبال کے لیے قطار در قطار کھڑے ہوتے ہیں۔ قرآن نے کیسے پیارے انداز میں اس کیفیت کو بیان فرمایا ہے۔

"اَلَّذِيْنَ يَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ"

"وہ متقی جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ خوش ہوتے ہیں- (اس وقت) فرشتے کہتے ہیں (اے خوش نصیبو!) سلامتی ہو تم پر- داخل ہو جاؤ جنت میں ان (نیک اعمال) کے باعث جو تم کیا کرتے تھے-" (قرآن ۱۶: ۳۲)

حدیث پاک میں آتا ہے کہ جب ملک الموت ان کے پاس آتا ہے- تو کہتا ہے **السلام علیک ولی الله الله یقرا علیک السلام** ---- "اے اللہ کے ولی -- تم پر سلامتی ہو- اللہ تعالیٰ بھی تمہیں سلام کہتا ہے-" اندازہ لگا لیجئے کہ کتنا خوش بخت ہے وہ انسان جو اس فانی دنیا سے جب رخت سفر باندھ رہا ہو تو رحمت کے فرشتے اس پر سلام بھیجیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی سلامتی کا پیغام آئے- **طیبة نفوسهم بالرجوع الی الله**

جب وعدہ پورا ہو چکا تو اللہ کے اس بندے کی پاک روح آسمانوں کی طرف پرواز کر جاتی ہے- اور اپنے رب کے پاس شاداں و فرحاں رہتی ہے- جب اس بندے کو دفن کر دیا جاتا ہے- تو اس قبر میں اس کی روح کو دوبارہ لوٹایا جاتا ہے- اور نکیرین سوالات کرتے ہیں- جب اللہ کا ولی ان سوالات کے صحیح جوابات دے دیتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے-

"نَمْ كَنَوْمَةِ الْعُرُوْسِ" (مشکوۃ شریف)

"(اے میرے ولی) اب تو دلہن کی طرح سو جا"

بے فکر - بے خوف - آرام و سکون کی نیند- اس کی قبر کشادہ کر دی جاتی ہے- جنت کی طرف سے کھڑکی کھول دی جاتی ہے- اور اس کی قبر پر رحمت کی بارش کا نزول ہونے لگتا ہے- اس کا قرب باعث برکت ہو جاتا ہے- اور جو بھی اللہ تعالیٰ کے اس برگزیدہ بندے کی قبر پر حاضر ہوتا ہے وہ بھی اللہ کی اس رحمت کے سایہ میں آجاتا ہے- جس کا نزول اس قبر پر ہو رہا ہوتا ہے- اس لیے صوفیاء کرام اور اولیائے

عظام کی قبروں پر حاضر ہونا بخشش کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان پر راضی ہو چکا ہوتا ہے۔ اور یاد رکھئے جس پر اللہ تعالیٰ راضی ہو چکا۔ اب اگر کوئی شخص اس ولی اللہ کی مخالفت کرتا ہے یا اس کے قرب کو غیر شرعی فعل گردانتا ہے تو وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے فیصلے کی مخالفت کر رہا ہوتا ہے۔ اور ایسے بدبخت کے لیے اللہ تعالیٰ کا واضح اعلان ہے۔

"جس نے میرے ولی کی مخالفت کی اس کے ساتھ میرا اعلان جنگ ہے"
(صحیح بخاری)

اب ایسے شخص سے زیادہ بدبخت کون ہو گا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اعلان جنگ کر دیا۔ اور اس سے منہ موڑ لیا۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل کو بلاتا ہے۔ فرماتا ہے اے جبریل میں اپنے فلاح بندے سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر۔ پس جبرئیلؑ بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ پھر وہ آسمان میں منادی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فلاں بندے سے محبت کرتا ہے۔ تم بھی اس سے محبت کرو۔ پھر سب اہل آسمان اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر زمین میں اس کی مقبولیت کا چرچا ہو جاتا ہے۔ (اور لوگ اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں)" (صحیح مسلم)

اب سمجھنے والی بات یہ ہے کہ ایسے متقی شخص سے نفرت کرنا خواہ اس کی ذات سے ہو یا اس کی قبر سے ہو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے کے مترادف ہے۔ اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ہاں اس کی قبر پر اگر کوئی غیر شرعی کام ہو رہا ہو تو اسے بند کرانا چاہیے نہ کہ صاحب قبر یا اس کے مزار ہی کے مخالف ہو جانا چاہیے "وَلْیٌ" کا معنی قرب اور نزدیکی ہے۔ وَلِیٌّ اس سے اسم ہے۔ اس کا معنی ہے قریب، محب، صدیق اور مددگار۔ الولی القرب و الدنو الولی اسم منہ بمعنی القریب والمحب والصدیق والنصیر۔" (قاموس و تفسیر ضیاء القرآن)

رجوع الی اللہ کی وجہ سے اب یہ قرب جو اللہ نے اپنے ولی کو عطا فرمایا ہے۔ یہ دنیاوی زندگی میں بھی ہوتا ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی ہوگا۔ اس لیے ایک ایسے شخص سے دور ہونا جس کو اللہ نے اپنے قرب میں جگہ دی ہو بدبختی اور بدنصیبی ہے۔ خواہ اس کی زندگی میں ہو یا بعد الموت۔

لہٰذا اولیائے کرام کی قبروں کی زیارت کرنا' وہاں فاتحہ پڑھنا باعث برکت ہے اور روحانی ترقی کا موجب بھی ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ کی توجہ خاص ہوتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کا وعدہ پورا کر چکا ہوتا ہے اور یہ محبت صرف دنیا ہی میں نہیں بلکہ آخرت کی زندگی میں بھی رہے گی۔

زیارت قبور کا حکم خود نبی اکرم ﷺ نے دیا ہے۔

"كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ مِنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا" (مشکوۃ باب زیارت القبور)

"میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا۔ مگر اب ان کی زیارت کیا کرو"

ہادی برحق ﷺ نے زیارت قبور کے جو فوائد بیان فرمائے وہ یہ ہیں"

۱۔ موت یاد آتی ہے

"زُوْرُو الْقُبُوْرَ فَاِنَّهَا تُذَكِّرُ الْمَوْتَ"

"قبروں کی زیارت کے لیے جایا کرو۔ قبریں موت یاد دلاتی ہیں۔" (صحیح مسلم)

اگر تو قبر کسی ولی اللہ کی ہے۔ جس نے دنیا میں اپنی زندگی کو رضائے الٰہی کی خاطر گزارا۔ اور لوگوں میں اچھی مثالیں قائم کیں۔ تو ایسی قبر کی زیارت کے بعد یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ میں بھی اس جیسی زندگی بسر کروں اور رضائے الٰہی حاصل کروں۔ اور اللہ کی محبت میں آجاؤں۔ یہ احساس اسے اپنے اعمال کو سنوارنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ اگر وہ ولی اللہ کی قبر کی زیارت بھی کرتا رہا اور اپنے اعمال کو بھی درست نہ کیا تو ایک نہ ایک دن اسے ندامت ضرور ہوگی۔ کہ میں کتنا بے حس ہوں کہ ابھی تک غلط کار ہوں۔ جب اسے یہ احساس ہوگا تو اللہ کی رحمت سے وہ اپنی اصلاح کرے گا۔ اور یہ زیارت اسے فائدہ دے گی۔

اور اگر یہ قبر کسی گنہگار کی ہے۔ جس کی معصیت آلود زندگی عوام کے سامنے گزری ہو تو ایسی قبر پر جانے والا شخص اس سے عبرت حاصل کرے گا۔ اور دعا کرے گا کہ اے اللہ اس قبر والے کو بخش اور مجھے ایسی گناہ آلود زندگی سے دور رکھ۔ اس لحاظ سے یہ زیارت بھی اسے گناہوں سے بچا لے گی۔ اور وہ عبرت حاصل کرکے اللہ کا خوف اپنے دل میں محسوس کرے گا۔ وہ سمجھے گا کہ یہ چند روزہ زندگی اس گنہگار نے عیش و عشرت میں گزار لی اب اس کا انجام کتنا بھیانک ہے۔

۲ - اہل قبور کے لیے دعائے مغفرت مانگ کر ان پر ایک قسم کا احسان کیا جاتا ہے

اگر عام لوگوں کا قبرستان ہے۔ تو جب بندہ ان کے لیے فاتحہ پڑھ کر ایصال ثواب کرتا ہے تو اہل قبور اس سے راحت حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے۔ کہ اگر عالم باعمل کسی قبرستان سے دعائے مغفرت کرکے گزر جائے تو چالیس روز تک عذاب قبر معاف کر دیا جاتا ہے۔

۳ - قبرستان میں جانے سے آخرت یاد آتی ہے

اس دنیا کی بے ثباتی سامنے آتی ہے۔ اور انسان سوچتا ہے کہ عمر تو گئی۔ اگر کچھ باقی ہے بھی تو کب تک زندہ رہوں گا۔ آخر یہی ٹھکانہ ہے۔ اور اصل گھر تو آخرت کا گھر ہے۔ جہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ لہٰذا وہ استغفار کرتا ہے۔ اور حضورؐ کے ارشاد فرمائے ہوئے ان الفاظ کو دہراتا ہے۔

"اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ - يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ اَنْتُمْ سَلَفُنَا وَ نَحْنُ بِالْاَثَرِ " (اے اہل قبور۔ تم پر سلامتی ہو اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے تم ہم سے پہلے چلے گئے ہو اور ہم تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔")

(ترمذی مسند احمد)

۴ - زیارت قبور باعث رحمت ہے

جب بندہ وہاں فاتحہ پڑھتا ہے ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے تو اس بندے پر اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے۔ اور جو قرآن اس نے پڑھا اس کا اجر و ثواب ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یاد آتا ہے اور اللہ کی یاد تو بہت بڑی بات ہے۔ اس طرح رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔

عرس

درحقیقت عرس اس مذہبی اجتماع کا نام ہے جو کسی ولی اللہ کی یاد میں منعقد کیا جاتا ہے۔ زیارت قبور کا حکم تو سرور کائنات ﷺ نے دے ہی دیا ہے۔ اس لیے عرس کا اجتماع کرنا۔ وہاں تبلیغ دین کرنا' ذکر الٰہی سے اپنے قلوب کی اصلاح کرنا اور وعظ و نصیحت سننا نہ صرف جائز ہے بلکہ باعث برکت و ثواب بھی ہے۔ اجتماع جمعہ کے دن بھی ہوتا ہے۔ عیدین کے موقع پر بھی مسلمان اکھٹے ہوتے ہیں۔ ہم مختلف اوقات میں مذہبی جلسے کرتے ہیں۔ ان کی تاریخیں اور دن مقرر کر کے اعلانات کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر عرس کے مذہبی اجتماع کا اہتمام کیا جائے اور وہاں تلاوت قرآن' اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا' ذکر الٰہی اور سیرت رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا جائے اور جس بزرگ کی وجہ سے اس اجتماع کا اہتمام کیا گیا ہے ان کے حالات زندگی بیان کئے جائیں۔ اور عوام الناس فی اللہ ملاقات کریں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کا احساس کریں اور صاحب طریقت (شیخ و مرشد) کی صحبت کیمیا میں رہ کر تزکیہ نفس کیا جائے تو ایسے اجتماع کو غیر شرعی کہنے والا خود شرع سے دور ہے۔

عرس کہتے ہی اس مذہبی اجتماع کو ہیں جو شریعت کے دائرے کے اندر رہ کر کیا جائے۔ اگر کوئی اجتماع غیر شرعی ہے تو وہ عرس نہیں ہوتا بلکہ میلہ ہوتا ہے۔ اور ایسے میلوں میں جانا جہاں گانا بجانا' راگ رنگ' اور دیگر غیر شرعی حرکات کھیل تماشے ہوتے ہیں ممنوع اور ناجائز ہے۔ ایسے اجتماع کو عرس کہنا قطعی طور پر غلط ہے۔

باقی رہا نام ---- تو اس مذہبی اجتماع کا نام "عرس" اس حدیث نبوی کے الفاظ پر رکھا گیا ہے۔ جس میں متقی صاحب قبر سے فرمایا جاتا ہے۔ نَمْ كَنَوْمَةِ

الْعُرُوْسِ بعض لوگوں کو اس نام پر اعتراض ہے لیکن اس نام کے رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس کی نسبت نبی کریم ﷺ کے الفاظ کے ساتھ ہے۔ اور یہ تو بہت ہی بابرکت نسبتی نام ہے۔ اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کسی غلط نام کو اپنے بندے کے ساتھ منسوب نہیں ہونے دیتا۔ لیکن ہم مسلمانوں میں سے بعض لوگوں کی عجیب عقل ہے۔ اگر کسی لفظ کی نسبت انگریزی زبان کے ساتھ ہو تو اعتراض نہیں کرتے مثلاً سیرت کانفرنس یا علماء میٹنگ وغیرہ اور اگر کسی لفظ کی نسبت حضور نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے لفظ کے ساتھ ہو تو اعتراض کرنے لگ جاتے ہیں۔

اسلام کی تبلیغ و ترویج کے لیے مذہبی اجتماعات کا اہتمام کرتے رہنا چاہیے۔ اس کی کہیں بھی کوئی ممانعت نہیں آئی۔ یہ تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دعوت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اور جو طاعت حق کی مخالفت کرے اس جیسا بدبخت کون ہو سکتا ہے۔؟

"حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان لوگوں سے میں ضرور محبت کرتا ہوں جو آپس میں میری وجہ سے محبت کرتے ہیں۔ میری رضا جوئی کے لیے ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں۔ اور میری خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں۔" (مسند احمد۔ موطا امام مالک - طبرانی)

عرس کے اجتماعات میں ایک ہی مرشد سے نسبت رکھنے والے آپس میں فی اللہ محبت رکھتے ہیں۔ اور صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اخلاص کا اظہار کرتے ہیں۔ اور صرف اس کی رضا کی خاطر خرچ کرتے ہیں۔

باب ۵

تکمیل تصوف

شریعت ۔ طریقت ۔ حقیقت ۔ معرفت

شریعت وہ ضابطہ حیات ہے۔ جو نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ لے کر مبعوث ہوئے۔ جو عین فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ اس میں نہ تو کوئی تنگی ہے اور نہ دشواری۔ سادہ اور آسان طریقہ حیات' جس پر ہر کوئی عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ہمارے رسول کریم ﷺ تک جتنے بھی انبیاء و رسل گزرے ہیں سب نے دین اسلام کی تبلیغ و ترویج فرمائی۔ دین وہی رہا مگر شریعتیں بدلتی رہیں۔ دین تو ہے **لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ**۔ مگر ہر رسول کے دور میں ضابطہ ہائے حیات بدلتے رہے۔ ہر دور اور ہر معاشرے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں پر قوانین اتارتا رہا۔ اور وہ قوانین صرف اس دور ہی کے لئے تھے۔ مگر جب حضورؐ رسالت مآب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی باری آئی تو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا ضابطہ حیات نازل فرمایا جو قیامت تک کے ہر دور ہر معاشرے اور ہر تہذیب و تمدن کے لیے مؤثر اور جامع ہے۔ یہ وہ اصول و ضوابط ہیں جو وحی الٰہی کے ذریعے قرآن پاک کی صورت میں خالق کائنات کی طرف سے نازل ہوئے۔ اور ان کو عملی طور پر بالتفصیل نبی کریم ﷺ نے سمجھایا۔ کتاب و حکمت کی تعلیم دی۔ ہر حکم کو کھول کر بیان فرمایا۔ اور ایک سنت قائم کی۔ جسے سنت رسول اللہؐ کہا جاتا ہے۔ اسی کا نام شریعت ہے۔

اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلاَ تَتَّبِعُوا السُّبُلَ۔

"بے شک یہی میرا سیدھا راستہ ہے۔ پس اسی کی پیروی کرو۔ اس کے علاوہ دوسرے مختلف راستے اختیار نہ کرو۔" (قرآن ۶: ۱۵۳)

نجات صرف اتباع شریعت ہی میں ہے۔ اور حضورؐ کی اتباع ہی سے اللہ تعالٰی کی محبت حاصل ہو سکتی ہے۔ اور سب ہدائتوں سے بہتر نبی کریم ﷺ کی ہدایت ہے۔

خَيْرُ الْهُدٰى هَدْىُ مُحَمَّدٍ صلی اللہ عَلیہ وَسلَّم۔

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مکتوبات میں شریعت' طریقت اور حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"شریعت کے تین جزو ہیں۔ علم' عمل اور اخلاص۔ ان کا حصول اللہ کی رضا کا حصول ہے۔ اور یہی رضا دنیا و آخرت کی تمام سعادتوں سے بڑھ کر ہے کوئی ایسا مطلب نہیں جس کے حاصل کرنے کے لیے شریعت کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت پڑے۔ طریقت اور حقیقت دراصل شریعت کے تیسرے جزو یعنی اخلاص کے کامل کرنے میں شریعت کی خادم ہیں۔ یعنی ان دونوں کی تکمیل سے مقصود شریعت کی تکمیل ہے نہ کوئی اور امراس کے علاوہ مطلوب ہے۔ احوال و مواجید اور علوم و معارف جو صوفیا کو اثنائے راہ میں حاصل ہوتے ہیں اصلی مقصود نہیں ہیں۔ بلکہ وہم و خیالات ہیں جن سے اطفال طریقت کی تربیت کی جاتی ہے۔ ان سب سے گزر کر مقام رضا تک پہنچنا ہے۔ جو جذبہ و سلوک کی منشا ہے تاکہ اخلاص حاصل ہو جائے کیونکہ اخلاص مقام رضا کا لازمی نتیجہ ہے۔" (مکتوبات دفتر اول)

آپ نے فرمایا:

"اکثر لوگ شریعت کو پوست اور حقیقت کو مغز خیال کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ بعض صوفیوں کی سکر و مستی میں نکلی ہوئی باتوں کے دھوکے میں آچکے ہیں۔ اور احوال و مقامات سے فتنے میں پڑ چکے ہیں-----"

(مکتوب دفتر اول بنام شیخ محمد چتری)

شریعت اور طریقت کی مزید تشریح میں لکھتے ہیں۔

"ظاہر و باطن آپس میں بال برابر بھی ایک دوسرے کے ساتھ مخالفت نہیں رکھتے۔

مثلاً زبان سے جھوٹ نہ بولنا شریعت ہے۔ اور دل سے جھوٹ کا خیال دور رکھنا
طریقت اور حقیقت ہے۔ اور اگر دل سے (جھوٹ کی) یہ نفی تکلف کے ساتھ ہے تو
طریقت ہے۔ اور اگر بے تکلف میسر ہے۔ تو حقیقت ہے۔ پس باطن جس کو طریقت
اور حقیقت کا نام دیا گیا ہے۔ ظاہر یعنی شریعت کو پورا اور کامل کرنے والا ہے۔"
(مکتوبات دفتر اول بنام شیخ درویش)

آپ فرماتے ہیں:

"تمام سعادتوں کا سرمایہ سنّت (شریعت) کی متابعت ہے۔ اور تمام فسادوں کی جڑ
شریعت کی مخالفت ہے۔ ہنود نے بہت ریاضتیں اور سخت مجاہدے کئے ہیں لیکن
شریعت کے موافق نہ ہونے کی وجہ سے سب بے اعتبار اور خوار ہیں---- کل
قیامت کے دن صاحب شریعت علیہ الصلوۃ والسلام کی متابعت ہی کام آئے گی۔
احوال و مواجید ' علوم و معارف ' اشارات و رموز اس متابعت کے ساتھ میسر ہو
جائیں تو بہتر اور زہے نصیب ورنہ استدراج اور خرابی کے سوا ان میں کچھ
نہیں----"

(مکتوبات دفتر اول بنام قلیچ خان)

مزید فرمایا:

"اپنے ظاہر کو ظاہر شریعت سے اور اپنے باطن کو باطن شریعت (یعنی حقیقت) سے
آراستہ کریں۔ اور حقیقت اور طریقت دونوں شریعت ہی کی حقیقت ہیں۔ نہ کہ
شریعت اور ہے اور طریقت و حقیقت کچھ اور۔ اور انہیں علیحدہ علیحدہ کرنا الحاد اور
زندقہ ہے۔" (مکتوب دفتر اول بنام شیخ محمد یوسف)

شریعت کے جتنے احکام ہیں۔ ان سب میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو حکم
شریعت نے جس صورت میں دیا ہے اسے اسی صورت میں بجالایا گیا ہے یا نہیں۔ اور
طریقت یہ ہے کہ شریعت کے اس حکم پر عمل کرنے میں خلوص ' نیک نیتی اور سچی
اطاعت کس قدر تھی۔اور اس عمل سے اخلاق و کردار پر کیا اثر پڑا ہے۔ اور جب

اس عمل کے اثرات ذہن و قلب میں بالیقین راسخ ہو جائیں تو یہ حقیقت ہے۔ کہ اس نے حقیقت کو پالیا۔ اور حق الیقین کا مقام اسے حاصل ہو گیا۔

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَاقَدَرُو اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ۔ "اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ کی جیسے حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا۔" اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

لو عرفتم اللّٰہ حق معرفتہ لمشیتم علی البحور و لزالت بدعائکم الجبال۔

"اگر تم اللہ کو جاننے کی طرح جانو (یعنی معرفت حق حاصل کرلو) تو تم پانی پر چل سکتے ہو اور پہاڑ تمہاری دعا پر حرکت میں آسکتے ہیں۔" (کشف المحجوب)

حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہ' سے معرفت الٰہی کے بارے میں پوچھا گیا۔ تو انہوں نے فرمایا:

"میں نے اللہ کو اللہ سے پہچانا اور جو ماسوا اللہ تھا اسے اللہ کے نور سے دیکھا۔"

معرفت در حقیقت اللہ تعالیٰ کی پہچان ہے۔ جب صوفی پر حقائق منکشف ہوتے ہیں اور وہ حق الیقین کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ تو اسے عرفان کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ فَھُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِنْ رَّبِّہٖ۔ "جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا وہ اپنے رب کی طرف سے ایک نور پر ہوتا ہے۔" (قرآن ۶: ۱۲۵)

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا۔ "معرفت وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے لطائف انوار سے دلوں میں ودیعت کرے" یہ دراصل اپنی ہی پہچان ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ

"جس نے اپنے آپ کو پہچانا۔ اس نے اپنے رب کو پہچانا۔"

اپنی پہچان یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو ہیچ تصور کرے اور اپنی نفی کر کے اپنی مرضی کو ختم کر دے اور صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں سر تسلیم خم کر دے۔ جب بندہ اپنی

نفی کرتا ہے۔ تو وہ درحقیقت مکمل طور پر اپنی ہستی کو مقامِ عجز پر پہنچاتا ہے اور سوائے حق تعالیٰ کے اس کی توجہ ماسوا سے ہٹ جاتی ہے۔ جب تک دل میں غیر کے لئے جگہ رہے گی معرفت حاصل نہیں ہوگی۔ اور عارف وہ ہے جو ماسوا سے ہٹ کر رجوع الی اللہ کرتا ہے۔

جب حقیقت کا علم ہو جاتا ہے تو پھر اس "حقیقت کل" یعنی حق تعالیٰ کی پہچان ہی معرفت ہے۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

"حق یہ ہے کہ جو بھی اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے۔ اس کے لئے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے۔ اور ایسے لوگوں کے لئے نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ غم۔" (قرآن ۲ : ۱۱۲)

پس جان لینا چاہیئے کہ تصوف ہمارا مقصود نہیں۔ ہمارا مقصود تو اللہ رب العزت ہے اس کی رضا اور محبت ہے۔ اس مقصود کو حاصل کرنے کے لئے تصوف کی ضرورت پڑتی ہے اور بس۔ تو جن لوگوں نے اس "ذریعے" کی قدر کی جس سے اللہ تک رسائی حاصل ہوئی وہ تو دونوں جہانوں میں کامیاب ہو گئے۔ اور جنہوں نے اسے سمجھا نہ قدر پہنچانی وہ خود بھی محروم رہے اور دوسروں کو بھی محروم رکھا۔

پس نجات، فلاح اور کامیابی و کامرانی اسی کے لیے ہے جو شریعت کے اصول و ضوابط پر عمل کرتا ہوا مرشد کی راہنمائی میں طریقت کے سیدھے راستے پر چلے اور اللہ تعالیٰ کے اسرار و رموز اور حقائق کا بالیقین مشاہدہ کرنے کے بعد معرفت الٰہی حاصل کرلے کہ یہی مقامِ رضا ہے۔